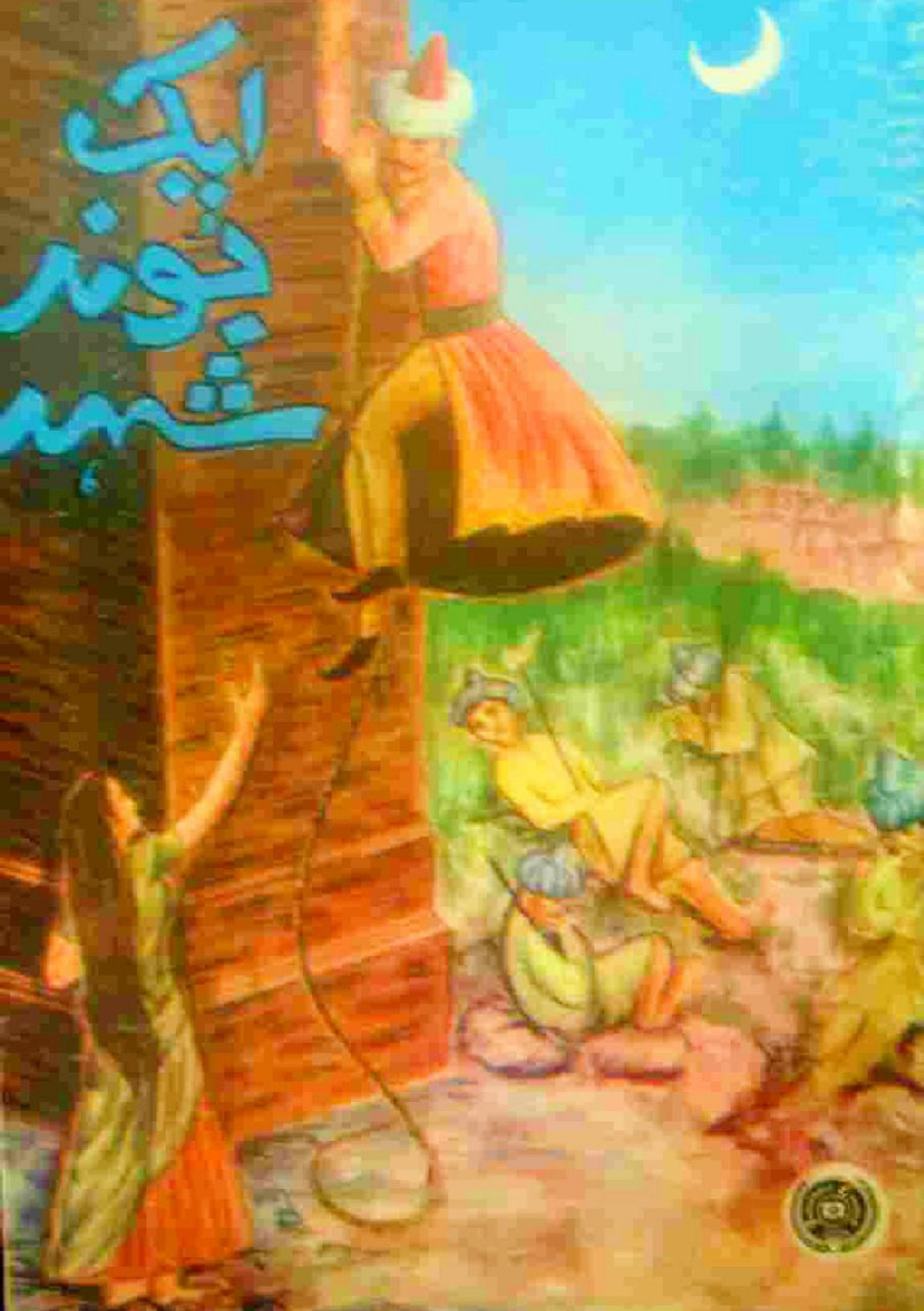

ایک پیوند شیشہ

ایک بوند شہد

برصغیر پاک و ہند کی کہانیاں

فرخندہ لودھی

فہرست

پہاڑی راج کماری ۷

مگرمچھ اور گیدڑ ۳۲

چوہے کی دلہن ۴۳

ایک بوند شہد ۵۷

دو بہنیں ۸۲

کچھوا اور ہنسوں کا جوڑا ۱۰۸

سِندھُو ۱۱۷

مکّار سادھو ۱۳۴

پہاڑی راج کماری

کسی پہاڑی ریاست میں ایک راجا راج کرتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ بڑی خُوب صُورت اور کومل۔ ستاروں کی طرح جھملاتی آنکھیں۔ گُلاب کے پھُول جیسا چہرہ۔ اُس کا نام تھا سریتا۔

سریتا جب پیدا ہوئی تو راجا نے مُلک کے تمام نجُومیوں کو اکٹھّا کیا اور راج کماری کی قسمت کا حال پُوچھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ سریتا کی زندگی میں غم اور خُوشی دونوں کا ساتھ ہو گا۔ اور یہ بھی بتایا کہ سریتا کی جیسی صُورت ہو گی ویسی ہی سیرت بھی ہو گی۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہ بتائی۔ بادشاہ نے اُن سب کو اِنعام دے کر رُخصت کیا۔

راج کُماری سریتا میں ایک عجیب و غریب چیز دیکھنے میں آئی۔ پیدائش کے وقت، قُدرت کی طرف سے اُس کے گلے میں سونے کا کنٹھا پڑا ہوا تھا۔ کنٹھے کے بارے

میں سب سے بڑے نجُومی نے راجا کو بتایا تھا کہ اس میں سریتا کی جان ہے۔ اگر اسے کوئی اور پہن لے تو سریتا مر جائے گی۔ اس لیے اس کی ہر وقت حفاظت کرنا۔

راج کُماری جب کُچھ سیانی ہُوئی تو راجا نے اُسے تاکید کر دی کہ اس کنٹھے کو کبھی بھی اور کِسی صُورت میں بھی اپنے سے جُدا نہ کرنا۔

راج کُماری سریتا چودہ برس کی ہُوئی تو اُس کے حُسن کے چرچے دُور دُور چل گئے۔ بہُت سے راجا اور راج کُمار اُس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جس نے بھی شادی کا پیغام بھیجا، راج کُماری نے اِنکار کر دیا۔ اس کے ماں باپ نے شادی کا معاملہ اُس کی مرضی پر چھوڑ رکھا تھا۔

چودھویں سالگرہ پر راجا نے بیٹی کو جُوتوں کا ایک جوڑا دیا۔ یہ جُوتے سونے کے تھے اور ان میں ہیرے اور لعل جڑے ہوئے تھے۔ اُن جیسے جُوتے دُنیا میں آج تک نہ بنے ہوں گے۔ یہ اِتنے نازک اور چھوٹے تھے کہ صرف سریتا ہی کے پاؤں میں آتے تھے۔ سریتا کو یہ جُوتے سونے کے اس کنٹھے سے بھی زیادہ

پیارے تھے جس میں اُس کی جان تھی۔ وُہ باہر سیر کرنے جاتی تو یہ جُوتے ضُرور پہنتی۔

راج کُماری جُوتے پہن کر باہر نکلتی تو سہیلیوں سے کہتی، "دیکھو، دیکھو۔ میرے سُنہری جُوتے کس قدر خُوب صُورت ہیں۔ ہیروں کی چمک دیکھو۔ لعلوں کی دمک دیکھو۔ اور زمرّد کی سبزی تو آگ کے شُعلوں کو ماند کرتی ہے۔"

ایک دن راج کُماری اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر سیر کرنے گئی اور پھُول چُنتے چُنتے ایک پہاڑی پر چڑھ گئی۔ اُس کا پاؤں پتھّر پر رپٹ گیا اور سونے کو جُوتا پاؤں سے اُتر کر پہاڑی کی دوسری طرف گھنے جنگل میں جا گرا۔

سریتا کو پتا چلا کہ جُوتا کھو گیا ہے تو وہ رونے لگی۔ وہ پھُولوں کی جھاڑیوں میں بیٹھی تھی۔ اُس کے ایک پاؤں میں جُوتا تھا اور دوسرا خالی تھا۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہُوا تھا وہ روئے جاتی تھی اور کِسی طرح چُپ نہ ہوتی تھی۔

گھر آئی تو راجا نے سمجھایا کہ بیٹی میں تُمہیں اس سے کہیں زیادہ خُوب صُورت جُوتا بنوا دوں گا۔ مگر راج کُماری کے آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ نوکروں نے

جنگل کا کونا کونا چھان مارا۔ شہر بھر میں منادی کرائی گئی، لیکن جُوتے کو نہ ملنا تھا، نہ مِلا۔ راجا نے جُوتا تلاش کرنے والے کے لیے بھاری اِنعام بھی مقرّر کیا مگر کوئی بھی جُوتا لے کر نہ آیا۔ جانے جُوتے کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان۔

اصل میں جب جُوتا گرا تو کُچھ ہی دیر بعد پڑوس کی ایک میدانی ریاست کے راجا کا بیٹا جنگل میں شکار کھیلتا ہُوا اُدھر آ نِکلا۔ اُس نے سونے کا جڑاؤ جُوتا پڑا ہُوا دیکھا تو جھٹ اُٹھا لیا اور سیدھا اپنی ماں کے پاس پُہنچا۔

ماں نے جُوتا دیکھ کر کہا۔ "بیٹا، ایسا قیمتی جُوتا تو کِسی راج کُماری ہی کا ہو سکتا ہے۔۔ کیا ہی اچھّا ہو جو اس جُوتے والی کو تلاش کر کے اُس سے شادی کر لو۔"

"لیکن میں اُسے ڈھونڈوں گا کیسے؟" راج کُمار نے پُوچھا۔

"بیٹا، ہم تمام شہروں میں خبر کر دیتے ہیں کہ ہمیں جنگل سے سونے کے جُوتوں کا ایک پیر مِلا ہے۔ جس کا ہو، آ کر لے جائے۔ اس طرح پتا چل جائے گا کہ جُوتے کی مالک کون ہے۔"

ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن کوئی راج کُماری جُوتے کی مالک نہ نکلی۔ راج کُمار کی ساری محنت بے کار گئی۔

ایک روز راجا کے دربار میں چند مسافر آئے۔ اُنہوں نے پہاڑوں کے راجا کی

اکلوتی بیٹی کا ایک جُوتا کھو جانے کا قصّہ میدانوں کے راجا کو سُنایا۔ پہاڑوں کا راجا اپنی دولت اور طاقت کی وجہ سے دُور دُور مشہور تھا۔ مُسافروں نے یہ بھی بتایا کہ جو شخص راج کُماری کا جُوتا ڈھونڈ کر راجا کو پیش کرے گا، اُس کو مالا مال کر دیا جائے گا۔

راج کُمار چُپ چاپ مُسافروں کی باتیں سُنتا رہا۔ پھر اُٹھ کر ماں کے پاس گیا اور کہا:

"میں اس جُوتے والی راج کُماری سے ملنے جا رہا ہُوں جو پہاڑوں میں رہتی ہے۔ میں یہ جُوتا اُسے واپس کر کے آؤں گا۔ آپ میرے لیے دُعا کیجیے۔"

"میرے بچّے، سنُو۔۔۔ پہاڑوں کا راجا بُہت دولت مند اور مغرور ہے۔ وہ تُمہیں روپیہ پیسے دینا چاہے گا، مگر تُم قبول نہ کرنا۔ خواہ وہ تُمہارے سامنے سونا چاندی کا ڈھیر ہی لگا دے۔ تُم ایک ہی بات کہنا کہ میں تو جُوتے کی مالکن راج کُماری اِنعام میں لُوں گا۔ اور کُچھ نہیں۔"

ماں نے بیٹے کو ساری باتیں سمجھا کر رُخصت کیا۔

راج کُمار گھوڑے پر سوار ہو کر سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ کئی دن تک چلتا رہا۔ کبھی اُس کا گُزر ریگستانوں سے ہوا اور کبھی گھنے جنگلوں سے۔ آخر کار وُہ پہاڑ کی تلہٹی میں اُس گھاٹ پر جا پہنچا جہاں سے سریتا کے باپ کے محل کو راستہ جاتا تھا۔

وہ راجا کے سامنے حاضر ہو کر آداب بجالایا اور راج کُماری کا جُوتا پیش کیا۔

"مانگو، کیا مانگے ہو؟" راجا نے پُوچھا اور پھر خُود ہی کہا:

"ہاں۔ جتنا چاہو سونا چاندی لے سکتے ہو۔ چاہو تو میرے اصطبل کے بہترین گھوڑے لے جاسکتے ہو۔"

"میں ان میں سے کسی چیز کا بھُوکا نہیں۔" راج کُمار نے جواب دیا۔

"تو پھر اور کیا چاہیے تمہیں؟"

"میرا اِنعام راج کُماری ہے۔" نوجوان راج کُمار نے جواب دیا۔

"لڑکے! تُم نے ایسی چیز مانگی ہے جو میں تُمہیں نہیں دے سکتا۔" راجا نے کہا۔

"میں نے یہ حق راج کُماری کو دے رکھا ہے۔ وُہ جِسے چاہے، شادی کے لیے پسند

کر لے۔"

"مہاراج، کیا میں راج کُماری سے مل سکتا ہوں؟" راج کمار نے پُوچھا۔

اس سوال پر راجا تھوڑا سا پریشان ہُوا۔ ویسے تو اُسے نوجوان راج کُمار پہلی ہی نظر میں پسند آ گیا تھا، لیکن اس سے سریتا کی شادی اس کی عزّت اور دولت میں اضافہ نہیں کر سکتی تھی، کیوں کہ وہ ایک چھوٹی سی ریاست کا راج کُمار تھا۔ اُسے اُمّید تھی کی کہ راج کُماری بھی میدانی علاقے کے اس راج کُمار کو خاطر میں نہ لائے گی۔

راج کُماری سریتا جھروکے میں سے جھانک رہی تھی۔ اس نے راج کُمار کو آتے ہُوئے دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اُس کے دل نے کہا تھا کہ یہی وہ راج کُمار ہے جس کے ساتھ شادی کرنے کے خواب تُم دیکھتی رہی ہو۔

جب راجا نے یہ معاملہ بیٹی کے سامنے رکھا تُو اُس نے انکار کرنے کے بجائے میدانوں کے راج کُمار سے شادی کرنے کی ہامی بھر لی اور کہا:

"ٹھیک ہے، ابّا جان۔ اگر وہ مُجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن وُہ میرا سونے کا جُوتا واپس کر دے۔"

دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہُوئی۔ سریتا دُلہن بنی چاند کو شرما رہی تھی۔

جو راج کُمار اور راجا سریتا نے شادی کرنے کے خواہش مند تھے، جل بھُن کر رہ گئے۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے:

"میدانی علاقوں سے آنے والا یہ ہے کون؟ اس کے ساتھ نہ کوئی بارات آئی، نہ کوئی پیدل نہ سوار، نہ باجانہ گاجا۔ گھوڑے پر چڑھ کر اکیلا چلا آیا، جیسے کوئی فوجی سپاہی ہو۔ اور صورت بھی کوئی ایسی اچھّی نہیں۔ سریتا کو نہ جانے اِس میں کیا نظر آگیا۔" جب شادی کا جشن ختم ہو گیا تو راج کُمار راجا کے پاس گیا اور بولا:

"مہاراج، میں اب اپنی دُلہن کو لے کر اپنے مُلک جانا چاہتا ہُوں۔ اجازت دیجیے۔"

راجا نے آہ بھرتے ہوئے کہا:

"ہاں بیٹا۔ دنیا کا یہی دستور ہے کہ بیٹیاں شوہروں کے گھر جا کر رہیں۔ میری بیٹی سریتا کا ہر طرح خیال رکھنا۔ اِسے کِسی قسم کی تکلیف نہ دینا۔ بڑے نازوں کی پلی ہے، میری بچّی۔ ایک بات کا خاص طور پر دھیان رکھنا۔ اس کے گلے میں جو سونے کا کنٹھا ہے، اُسے کوئی دوسرا نہ پہنے۔ اگر یہ کنٹھا کِسی دُوسرے نے پہن لیا

تو سریتا مر جائے گی۔"

راج کُمار نے سریتا اور اُس کے کنٹھے کی حفاظت کا پکّا وعدہ کیا اور اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر اپنے ملک کو روانہ ہو گیا۔ سریتا کا باپ اُنہیں خُدا حافظ کہنے کے لیے دُور تک اُن ساتھ گیا۔ اُس نے اپنی بیٹی کو بہُت سی دولت، ہیرے جواہرات، اُونٹ، ہاتھی اور گھوڑے دیے۔ قیمتی کپڑے، قالین، غالیچے غرض ہر چیز اس نے اپنی پیاری بیٹی کو دی تھی۔

میدانوں کے بُوڑھے راجا اور رانی نے جب بیٹے اور بہو کو آتے دیکھا تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سریتا کو بھی ساس اور سُسر بہت پسند آئے۔ لیکن اِس خوشی اور چہل پہل میں گھر والے ایک شخص کو بالکل بھُول گئے۔ یہ تھی راج کُمار کی پہلی بیوی۔

ملک کی رسم کے مطابق راج کُمار کی پہلی شادی بچپن ہی میں ہو چکی تھی۔ سریتا اُس کی دوسری بیوی تھی اور وہی اُس کی اور اُس کے ماں باپ کی چہیتی بہو تھی۔

پہلی بیوی مینا، جس کے ساتھ راج کُمار کی بچپن میں شادی ہوئی تھی، بدمزاج،

چڑچڑی اور جل کُکڑی تھی۔ اس کی کِسی کے ساتھ نہ بنتی تھی۔ وہ سریتا سے بُہت جلتی تھی۔ لیکن سریتا اس کو اپنی بڑی بہن سمجھتی تھی۔ اُس کی ہر بات کو خیال رکھتی۔ اُس کی عزّت کرتی۔ پر مینا اسی تلاش میں رہتی کہ کسی طرح سریتا کو دُکھ پہنچائے۔ ایک روز سریتا کی ساس نے اس سے کہا:

"سریتا بیٹی، مینا سے ذرا دُور ہی رہا کرو۔ وہ تُم سے جلتی ہے کیوں کہ تُم نے اُس کی جگہ لے لی ہے۔ مُجھے یہ ڈر ہے کہ وہ تُم کو نقصان نہ پہنچائے۔"

سریتا نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا:

"امّاں جان، مجھے مینا بہن سے کوئی خطرہ نہیں۔ وُہ مُجھ سے جلتی ہیں تو یہ قدرتی بات ہے۔ لیکن اگر میں اُن کے ساتھ پیار سے پیش نہ آؤں تو وہ بھی مُجھ سے پیار کرنے لگیں گی۔ پیار ہی سے دوسرے کا دِل جیتا جا سکتا ہے۔"

مہارانی نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولی۔ "کاش! ایسا ہی ہو۔"

کُچھ دِن بعد راج کُمار کو کہیں سفر پر جانا پڑا۔ وُہ سریتا کو ماں باپ کے حوالے کر

کے چلا گیا۔ ساس سُسر کو تو سریتا سے پیار تھا۔ اُنہوں نے خُوشی سے اُس کی دیکھ بھال کا ذمّہ لے لیا۔

راج کُمار کے جانے کی دیر تھی کہ مینا نے سریتا کو راستے سے ہٹانے کی ترکیبیں سوچنا شروع کر دیں۔ اس نے سریتا سے کہا:

"سریتا بہن۔ تم نئی نئی یہاں آئی ہو۔ یہاں تُمہاری جان نہ پہچان۔ تُم میرے پاس آجایا کرو۔ تُمہارا دِل بھی بہلے گا اور میرا بھی۔"

سریتا کو اور کیا چاہیے تھا۔ سہیلیاں تو وُہ میکے میں چھوڑ آئی تھی۔ وہ ہر روز سہ پہر کو مینا کے پاس جا بیٹھتی یا مینا اُس کے پاس چلی آتی۔ سریتا خُوشی سے اپنے زیور اور کپڑے دِکھاتی جیسے مینا اُس کی بڑی بہن ہو۔

ایک بار سریتا نے اپنے سونے کے جُوتے بھی مینا کر پہننے کے لیے دیے لیکن وہ اِتنے چھوٹے تھے کہ مینا کے پاؤں میں نہیں آئے۔

اس پر مینا جل بھُن کر کوئلا ہو گئی۔ مہارانی نے اسے زور زور سے بولتے سُنا تو پتا چلا

کہ وہ اس بات پر چلّا رہی ہے کہ چھوٹی راج کُماری کے پاس اُس سے زیادہ زیور اور ہیرے جواہرات کیوں ہیں۔ مہارانی نے پھر سریتا کو سمجھایا:

"بیٹی، مینا پر بھروسا نہ کرو۔ وہ تُم سے جلتی ہے۔" لیکن سریتا نے جواب دیا۔ "بے چاری مینا بہن کا دل چاہتا ہے کہ وہ بھی میرے جیسے جڑاؤ جُوتے پہنے۔"

ایک روز راج کُمار کی دونوں بیویاں اکٹھّی بیٹھی تھیں کہ مینا نے اچانک سوال کیا۔

"سریتا، تُم یہ سونے کا کنٹھا ہر وقت کیوں پہنے رہتی ہو؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

سریتا نے سادگی سے جواب دیا۔ "اس میں میری جان ہے۔ مُجھے اسے ہر وقت پہننا پڑتا ہے۔ میں نہ پہنوں اور کوئی دوسرا پہن لے تو میں اُسی وقت مر جاؤں گی۔"

مینا کا مُنہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ وہ بولی۔ "پھر تو تُمہیں بہُت ہی اِحتیاط کرنا چاہیے۔ تُم

نے اسے اچھی طرح بند تو کروادیا ہے نا؟"

"دوہرے قُفل لگوا رکھے ہیں۔" سریتا نے جواب دیا۔ "لیکن اِسے سر کے اُوپر سے آسانی کے ساتھ اُتارا جا سکتا ہے۔ مگر میں اُس کو کبھی نہیں اُتارتی، خواہ مخواہ کوئی چُرا لے تو۔۔۔ مُجھے زندگی بُہت پیاری ہے، مینا بہن۔ میں بُہت سُکھی ہُوں اور جینا چاہتی ہُوں۔"

"اس میں کیا شک ہے تم بہت سُکھی ہُو۔" مینا نے کہا۔ لیکن دِل ہی دِل میں وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اگر سریتا مر جائے تو راج کُمار تُو کیا، ہر چیز اُس کی ہو جائے گی۔

اُس رات مینا نے اپنی نوکرانی کو سریتا کے کمرے میں بھیجا تا کہ وہ سونے کا کنٹھا چُرا لائے۔ نوکرانی گئی تو سریتا اُس وقت گہری نیند سو رہی تھی۔ نوکرانی نے چُپکے سے اُس کے گلے سے کنٹھا اُتارا اور اپنے گلے میں پہن لیا۔ اسی وقت سریتا کی رُوح نِکل گئی۔ اب وہ مُردوں کی طرح پلنگ پر پڑی تھی۔

صُبح سویرے سریتا کی نوکرانیاں اُس کے کمرے میں آئیں اور اُسے جگانے لگیں۔ اُن کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔ سریتا کو نہ اُٹھنا تھا نہ اُٹھی۔ نوکرانیاں روتی

چیختی مہارانی کے پاس گئیں۔ وہ بھی بھاگی بھاگی سریتا کے کمرے میں آئی۔ سریتا کو ہوش میں لانے کی بڑی تدبیریں کی گئیں لیکن وہ تو اِس طرح لیٹی تھی جیسے ہمیشہ کی نیند سو گئی ہو۔ اگرچہ اُس کے گالوں پر وہی سُرخی تھی جو ہمیشہ ہُوا کرتی تھی۔ ہونٹوں پر مُسکراہٹ بھی کھیل رہی تھی۔

مہارانی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”ہائے! اب میں راج کُمار کو کیا مُنہ دکھاؤں گی۔“

محل کے سارے لوگ غم سے بے حال تھی۔ کسی کو سونے کے اُس کنٹھے کا خیال ہی نہ آیا جو سریتا کے گلے میں پڑا رہتا تھا۔ سب کو یہ فکر تھی کہ راج کُمار آئے گا تو کیا کہے گا؟ اُس کو یہ خبر کیسے سُنائی جائے گی؟ راجا اور رانی کی پریشانی سب سے زیادہ تھی، کیوں راج کُمار راج کُماری کو اُن کے سپرد کر کے گیا تھا۔ رانی رو رو کر کہہ رہی تھی:

”ہائے ہائے! اب کیا ہو گا۔ راج کُمار راج کُماری کو نہ دیکھے گا تو غم سے مر جائے گا۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے گا۔“

راجا نے رانی کو تسلّی دیتے ہوئے کہا:

”میں اتنا اِنتظام کر سکتا ہوں کہ جب وہ آئے تو سریتا کو دیکھ سکے۔ ہم اس کے لیے شیشے کا مقبرہ بنا دیں گے اور یہ وہاں اپنے پلنگ پر لیٹی رہے گی، جیسے سو رہی ہے۔ ہمارا بیٹا اس کو دیکھتا رہے گا۔“

آخر اُنہوں نے جنگل میں ایک ایسی جگہ تلاش کی جہاں لوگوں کا گُزر نہ تھا۔ اُس کے پاس ہی ایک چھوٹا سا چشمہ بہتا تھا۔ اس جگہ شیشے کا مقبرہ بنوا کر اُس میں راج کُماری کا پلنگ رکھ دیا گیا۔ پھر مقبرے کو اچھی طرح بند کر دیا گیا۔ سریتا پلنگ پر لیٹی بالکل ایسی لگی تھی جیسے سو رہی ہو۔ راجا اور رانی آنکھوں میں آنسو لیے دیر تک اُسے دیکھتے رہے اور پھر محل میں چلے آئے۔ اُنہیں راج کُمار کی واپسی کا انتظار تھا۔

آدھی رات کو ایک عجیب واقعہ ہُوا۔ مکّار نوکرانی نے رات کو سونے سے پہلے کنٹھا اُتار کر تپائی پر رکھ دیا اور خود سو گئی۔ کنٹھے کا اُس کے گلے سے اُترنا تھا کہ سریتا میں جان پڑ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو بڑی حیران ہوئی۔ سوچنے لگی ”میں کہاں ہوں؟“

اُس کے چاروں طرف جنگل تھا۔ آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ قریب ہی کہیں گیدڑ بول رہے تھے۔ درختوں میں کبھی کبھی کوئی ڈری سہمی چڑیا چُوں چُوں کرنے لگتی۔ بڑا ڈراؤنا سماں تھا۔

"شاید میں خواب دیکھ رہی ہوں۔" راج کُماری نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

اُدھر محل میں مکّار نوکرانی کو ایک ڈراؤنا خواب دکھائی دیا اور اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اس نے اُٹھ کر جلدی سے کنٹھا پہن لیا۔ اُسی وقت راج کُماری کی روح اُس کے جسم سے نِکل گئی۔

اسی طرح کئی دن اور کئی راتیں گُزر گئیں۔ جب راج کُمار واپس آیا اور اُسے پتا چلا کہ اُس کی چہیتی بیوی مر گئی ہے تو وہ غم تم سے پاگل ہو گیا۔ وُو چیختا تھا اور پاگلوں کی طرح پُکارا تھا۔ "سریتا! سریتا"!

مینا بھاگی بھاگی آئی اور راج کُمار کے قدموں میں گِر گئی۔ لیکن اُس نے اُسے پرے ہٹا دیا جیسے وُہ کوئی زہریلی ناگن ہو۔

آخر راجا اور رانی نے راج کُمار کو شیشے کے مقبرے کا بتایا اور کہا کہ ہم نے جنگل میں ایک شیشے کے مقبرے میں اُس کی لاش رکھ دی ہے تا کہ تُم وہاں جا کر اُس کو دیکھ لیا کرو۔ راج کُمار یہ سُنتے ہی جنگل کی طرف بھاگا۔

مقبرے کے چاروں طرف خاموشی تھی، اور مقبرے کے اندر پلنگ پر راج کماری لیٹی تھی، بالکل ایسے جیسے گہری نیند سو رہی ہو۔ اُس کے ہونٹوں پہ پیاری سی مُسکراہٹ کھیل رہی تھی اور چہرے پر گُلاب کے پھولوں کی سی تازگی تھی۔

راج کُمار گھُٹنوں کے بل جھک پر راج کُماری کو دیکھنے لگا۔ اُس کو گزرے ہُوئے دِنوں کی یاد آ گئی جب وہ اکٹھے رہتے تھے، ہنستے تھے، بولتے تھے۔ وُہ دِن کتنے خُوب صُورت تھے۔ اِتنا پیار کرنے والی، اِتنی مہربان بیوی مر کیسے سکتی ہے؟

راج کُمار سوچ سوچ کر رو رہا تھا اور رو رو کر سوچ رہا تھا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ وہ سارا دِن مقبرے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا، لیکن راج کماری کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ نہ مقبرے کے آس پاس کوئی پرندہ چہچہایا، پتّا تک نہ کھڑکا۔ مکمّل خاموشی چھائی رہی۔ ہَولے ہَولے دِن کی روشنی

بُجھنے لگی۔ چاند نِکل آیا۔ محل کے ملازم راج کُمار کو لینے کے لیے آ گئے۔

جُوں ہی راج کمار وہاں سے نِکلا، سریتا کے جسم میں دوبارہ جان پڑ گئی۔ اب وہ چشمے کے بہتے پانی کی آواز سُن سکتی تھی۔ وہ اُٹھی اور مقبرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ چاندنی میں چشمہ تلاش کیا، ہاتھ کی اوک سے پانی پیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

اُسی رات اُس کو خُدا نے ایک بچّہ عطا کیا۔ وُہ ماں بن کر بہت خُوش ہوئی اور بچّے کو اپنے ساتھ پلنگ پر لٹالیا۔ لیکن جیسے ہی سورج طلوع ہوا وہ پھر مر گئی۔ بچّہ اُس سے چمٹا ہپُوا رو رہا تھا۔

غم سے نڈھال راج کُمار اُس روز مقبرے پر نہیں گیا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں محل میں پڑا رہا۔ لیکن رات تو جیسے ہی چاند نِکلا، وُہ دیوانوں کی طرح جنگل کی طرف بھاگا اور سیدھا اپنی بیوی کے مقبرے کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں اُس کو ایک ننّھے سے بچّے کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ وہ ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا اور غور سے مقبرے کو دیکھنے لگا۔

اچانک مقبرے کا دروازہ کھُلا اور سریتا ایک مُنّے سے بچّے کو گود میں لیے باہر نکلی۔ وُہ آہستہ آہستہ چشمے کی طرف جارہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے تو راج کُمار پتھرا کے رہ گیا۔ نہ اُس سے بولا جاتا تھا، نہ وُہ کوئی حرکت کر سکتا تھا۔ حیرت نے اُس کے پاؤں جکڑ لیے تھے اور خُوشی نے اُس کی زبان گُنگ کر دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہمّت کر کے، وہ راج کُماری کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

راج کُماری نے پہلے ہاتھ مُنہ دھویا اور پھر اوک سے پانی پیا۔ بچّہ چشمے کے کنارے نرم گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی چیخیں اِیسی تھیں جیسے جنگلی پرندہ چیخ رہا ہو۔ ماں نے بچّے کو گود میں لے لیا اور اُسے چپ کرانے لگی۔ جوں ہی وہ مقبرے میں واپس جانے کے لیے مُڑی۔ اُس کی نظر اپنے شوہر پر پڑی۔

چند لمحے وہ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ سریتا نے مُنہ سے کُچھ نہ کہا اور بچّہ راج کُمار کی طرف بڑھا دیا۔ راج کُمار نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ یہ سچ تھا کہ سریتا زندہ تھی۔ باقی سب ایک ڈراؤنا خواب تھا۔

سریتا نے ایک ایک بات راج کُمار کو کہہ سُنائی۔ اُس کو یہ تو معلوم تھا کہ کنٹھا کھو جانے کی وجہ سے وہ مر جاتی ہے لیکن یہ خبر نہ تھی کہ یہ کنٹھا چُرایا کس نے ہے۔

راج کُمار دوڑتا ہوا محل میں واپس آیا اور حکم دیا کہ محل میں رہنے والا ہر شخص اُس کے سامنے اُسی وقت حاضر ہو۔ سب سے پہلے راجا اور رانی اپنے نوکروں سمیت آئے۔ اُنہیں کِس بات کا ڈر تھا۔ راج کُمار نے نوکروں کو اچھّی طرح دیکھا بھالا اور وہ چلے گئے۔ پھر سریتا کی کنیزیں آئیں۔ وہ اپنی مالکن کے غم میں نڈھال تھیں۔ وہ روتی روتی آئیں، تلاشی دی اور چلی گئیں۔ راج کُمار کو اُن پر ترس آ رہا تھا۔

راج کمار کی پہلی بیوی نے پیغام بھیجا کہ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں، اس لیے وہ نہیں آ سکتی۔ لیکن راج کُمار نے حکم دیا کہ وہ جس حال میں بھی ہے، اپنی نوکرانیوں کو ساتھ لے کہ حاضر ہو اور باقی لوگوں کی طرح تلاشی دے۔ سومینا کو آنا پڑا۔

مینا نے اپنی نوکرانی سے سرگوشی میں کہا: ”کنٹھا اُتار دو۔“

”سریتا کو دوبارہ زندہ کر دوں؟“ نوکرانی نے پوچھا۔ وہ ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔

”ہاں اور کنٹھے کو اپنی ساڑھی کے نیچے چھُپالو“ مینا نے حکم دیا۔ ”پھر جلدی جلدی راج کُمار کے سامنے سے آنکھیں جھکائے گُزر جاؤ۔“

پہلے مینا بڑے غُرور اور بے پروائی سے سر اُٹھائے، ہولے ہولے راج کُمار کے سامنے سے گُزری لیکن راج کُمار نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اُس کی نظریں تو اُس نوکرانی پر جمی ہوئی تھیں جو مینا کے پیچھے سر جھکائے چلی آ رہی تھی۔

”رُک جاؤ!“ راج کُمار نے چیخ کر کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا اِس عورت کو پکڑ لو اور اِس کی تلاشی لو۔

سپاہیوں نے حکم کی تعمیل کی۔ کنٹھا نوکرانی کے گلے میں چمک رہا تھا۔ اسی میں سریتا کی جان تھی۔

"تُمہیں جو سزا بھی دی جائے کم ہے۔" راج کُمار نے کہا اور کنٹھا مکّار عورت کے گلے سے اُتار لیا۔ "لے جاؤ اِس مکّار عورت کو۔" راج کُمار نے غُصّے سے کہا اور پھر مینا کو پرے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "تم سے میں بعد میں نپٹ لوں گا۔ اس وقت میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔"

اب راج کُمار کنٹھا ہاتھ میں پکڑے جنگل کی طرف بھاگا۔ مقبرے میں داخل ہو کر اُس نے جلدی سے وہ کنٹھا سریتا کے گلے میں ڈال دیا اور کہا:

"جاگ اُٹھو! جاگ اُٹھو، سریتا"!

سریتا نے کنٹھا پہنتے ہی آنکھیں کھول دیں۔ پھر مُسکراتے ہوئے بچّے کو اُٹھایا اور سینے سے لگا کر پیار کیا۔

راج کُمار کے پیچھے پیچھے راجا اور رانی بھی آ گئے۔ اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔ سریتا نے بچّے کو اُن کی گود میں دے دیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی تا کہ ساس، سُسر اُس کو دُعائیں دیں۔۔۔ ننّھے مُنّے بچّے نے ہاتھ بڑھا کر ماں کے گلے میں پڑے ہوئے سونے کے کنٹھے کو پکڑ لیا۔

راج کُمار نے بیٹے سے کہا۔ نہ نہ بیٹے۔ مُجھ سے ساری دنیا لے لو لیکن یہ نہ لینا۔ اس میں تُمہاری ماں کی جان ہے۔

مگرمچھ اور گیدڑ

کچھوا اور مگرمچھ دریا کے کنارے دھوپ تاپا کرتے تھے۔ اُن کی ہر روز ملاقات ہوتی، اس لئے ایک دوسرے کا حال چال پوچھتے پوچھتے دونوں کی دوستی ہو گئی۔ دونوں خُوب گپیں ہانکتے۔ زیادہ باتیں جنگل کے جانوروں کے بارے میں ہوتیں، کیوں کہ وُہی سہ پہر کو دریا سے پانی پینے کے لیے آتے تھے۔

عام طور پر جنگلی جانور اس وقت آتے جب انہیں یقین ہوتا کہ مگرمچھ قریب نہیں ہے۔ جن جانوروں نے اِحتیاط نہ کی اُنہیں کبھی گھر جانا نصیب نہ ہُوا۔ کچھوا ہی ایسا جانور تھا جو اپنے سخت خول کی وجہ سے مگرمچھ کا نوالہ بننے سے بچا ہوا تھا۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ مگرمچھ کو جب بھُوک زیادہ ستاتی تو اُس کی نظر اپنے دوست کچھوے پر جا پڑتی۔ مگر وہ اپنے خول کی وجہ سے ہمیشہ بچ جاتا۔

ایک روز مگرمچھ نے کچھوے سے پُوچھا:

"کیوں بھائی، تُم نے کبھی گیدڑ کو اِدھر آتے دیکھا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن میں نے اُسے اُدھر پہاڑی چٹانوں پر چِلّاتے سُنا ضُرور ہے۔" کچھوے نے جواب دیا۔

مگر مچھ نے کہا۔ "میرا خیال ہے، اُسے پیاس لگی ہو گی۔ جبھی چِلّا رہا ہے۔ چچ چچ۔ بے چارہ گیدڑ، مُجھے بڑا ترس آتا ہے اُس پر۔ بے چارہ، میرے ڈر سے پانی پینے نہیں آتا۔ کچھوے بھائی، اگر کہیں گیدڑ مِلے تو اُس سے کہنا کہ وہ جب چاہے، جہاں سے چاہیے، آکر پانی پی لے۔۔۔ لو بھلا، پانی مُجھ اکیلے کی ملکیّت تھوڑی ہے۔ سب کا حق ہے اس پر۔

"نہیں جی۔ وہ ہر گز نہیں آئے گا۔" کچھوے نے جواب دیا۔ "وہ تُم سے بُہت ڈرتا ہے۔ یہاں آکر پانی پینا تو ایک طرف رہا، وہ تو تُمہارے سائے بھی بھاگتا ہے۔"

"مُجھ سے کیوں ڈرتا ہے؟ ہاہاہا!" مگر مچھ ہنسا "اچھّا! اب میں سمجھا۔ جب میں بھُوکا ہوتا ہوں تو غضب ناک ہو جاتا ہوں۔ بھُوک کے وقت میرے جبڑے چکّی کے

پاٹوں کی طرح چلنے لگتے ہیں، اور میری دُم تڑپ تڑپ کر پانی میں جھاگ اُڑاتی ہے۔ لیکن بھائی، اس وقت تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ذرا پہاڑی پر جاؤ اور گیدڑ ملے تو اُسے سمجھا بجھا کر لے آؤ۔ میں تو ذرا آرام کرنے لگا ہوں۔ رات کے کھانے تک سویا رہوں گا، اور اُسی وقت جاگوں گا جب بے چارہ گیدڑ پانی پی کر جا چُکا ہو گا۔"

کچھوا پہاڑی کے پاس پہنچا تو گیدڑ سچ مُچ ایک چٹان کے پیچھے چھُپا بیٹھا تھا اور کسی پرندے کو نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ کچھوے نے اُسے آواز دی تو اُس نے حلق میں پھنسے ہوئے پروں کو تھُوکتے ہُوئے پُوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے۔" کچھوے نے بتایا۔ "مجھے مگرمچھ نے بھیجا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ گیدڑ سے کہہ دو، وہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے پانی پی لے۔ میری اور گیدڑ کی کیا دُشمنی۔ دریا سب کا ہے۔ اور میاں گیدڑ، میرا خیال ہے پرندے کا گرم گرم گوشت کھانے کے بعد تُمھیں اس وقت پیاس تو ضُرور لگی ہو گی۔۔۔ ہے نا؟"

گیدڑ گلا صاف کرنے کے لیے کھانسا۔ اصل میں پرندے کی دُم کا لمبا پر اُس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔

"دیکھا نا۔ میں نہ کہتا تھا کہ تُمہیں پیاس لگی ہے، پانی کے بغیر یہ نوالہ نیچے نہیں اُترے گا۔"

گیدڑ نے کہا۔ "نہ جی نہ۔ میں وہاں گیا تو مگرمچھ مُجھے کھا جائے گا۔ میں سب چکّر جانتا ہُوں۔"

یہ سُن کر کچھوے کو بے حد صدمہ ہُوا گیدڑ کِسی طرح مان ہی نہیں رہا تھا۔ اُس نے چاپلوسی کرتے ہوئے کہا:

"واہ گیدڑ بھائی۔ میں تو سمجھا تھا تُم بڑے عقل مند ہو۔ تُمہیں غلط فہمی ہے۔ مُجھے دیکھو۔ دریا میں مگرمچھ کے ساتھ رہتے ایک زمانہ گُزر گیا۔ ابھی تک زندہ ہوں۔ تمہارے سامنے بیٹھا ہُوں۔ وہ ایسا ہی ظالم ہوتا تو سب سے پہلے مجھے کھاتا۔" گیڈر زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہنس ہنس کر اُس کے پیٹ میں بَل پڑ گئے۔ پھر ہانپتے ہوئے بولا:

"جاؤ، کچھوے میاں۔۔۔ جا کر اپنے یار سے کہہ دو کہ میں پیاسا نہیں ہُوں۔ اپنا کیچڑ بھرا پانی اور ہی پی لے اور پی پی کر مر جائے۔"

کچھوے نے غُصّے سے کہا۔ ”تُم بڑے گُستاخ ہو۔“ اور پھر اپنی سخت پیٹھ کو پتھروں سے بچاتا ہوا دریا کی طرف چل دیا تا کہ سارا قصّہ مگرمچھ کو سنائے اور بتائے کہ گیدڑ بڑا چالاک ہے۔ مگرمچھ نے لمبی آہ بھرتے ہوئے اُداس لہجے میں کہا:

”ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی کسی کا بھروسا نہیں کرتا۔ کوئی کسی کی محبت کو نہیں پہچانتا۔ مُجھے اب کوئی اور ترکیب کرنی پڑے گی۔۔۔ اصل میں مِیں چاہتا ہُوں کہ گیدڑ بے چارہ پیاسا نہ مرے۔“

یہ کہہ کر مگرمچھ نے اپنی چُوسیاں سی آنکھوں پر بھاری بھاری پپوٹے گرا لیے اور چُپ چاپ اُس جگہ لیٹ گیا جہاں دریا کا پانی ختم ہوتا تھا اور خُشکی شروع ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سو رہا ہے۔ مگر وُہ سویا نہیں تھا۔ وہ تو کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اچانک آنکھیں کھول کر بولا:

”کچھوے بھائی، میرے دماغ میں ایک ترکیب آتی ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے کے لیے تُمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔ اور مجھے اُمّید ہے تم ضُرور کرو گے۔ غور سے سنو۔ میں دریا سے نِکل کر کنارے پر چلا جاؤں گا اور وہاں کسی درخت کے

نیچے ایسے لیٹ جاؤں گا جیسے مرا ہوا ہوں۔ تُم یہ کرنا کہ کہیں سے بُہت سارے پھُول لا کہ میرے اوپر ڈال دینا اور رونا پیٹنا شروع کر دینا، جیسے میرا بین کر رہے ہو۔ یہ دیکھ کر گیدڑ دریا پر پانی پینے آئے گا۔ جیسے ہی وہ پانی پی کر لوٹے گا میں اُسے پکڑ کر ہڑپ کر جاؤں گا۔"

"ٹھیک۔۔۔۔" کچھوے نے سر ہلا کر جواب دیا۔ مگر مچھ اپنی ترکیب سُنا کر بے حد خُوش تھا۔ کچھوا گیدڑ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ گیدڑ کیا، اُسے کوئی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وُہ فوراً مگر مچھ کی مدد پر تیّار ہو گیا۔ لیکن جانے سے پہلے بولا:

"اِتنا یاد رہے کہ گیدڑ نہایت مکّار جانور ہے، ایسا نہ ہوتا تو بُہت پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔"

"بھئی، تُم جاؤ تو سہی۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے باتیں بنائے جاتے ہو۔ میں نے جس طرح کہا ہے اُسی طرح کرنا۔ آج کل گُل مہر کے پھُولوں پر بہار ہے۔ بڑے درخت کے نیچے پھُولوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہیں۔ اِن سب کو اکٹھا کر کے مُجھ پر ڈال دو۔ اِتنے ڈالو کہ میں چھُپ جاؤں۔ سمجھے؟"

کچھوا دوبارہ چٹانوں کی طرف چل دیا۔ مگر مچھ اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کُچھ دُور چل کر وُہ گل مہر کے درخت کے نیچے لیٹ گیا، آنکھیں بند کر لیں اور یوں دم سادھ لیا جیسے مر گیا ہے۔ اُسے اس طرح لیٹا دیکھ کر اُس پر مکھّیاں بھِنبھنانے لگیں لیکن وُہ چُپ چاپ لیٹا رہا۔

کچھوے نے گُل مہر کے پھُول اکٹھّے کیے اور اپنے دوست کے اُوپر ڈال دیے۔ مگر مچھ سر سے پاؤں تک پھُولوں میں چھُپ گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر کچھوا گیدڑ کے پاس گیا تا کہ یہ افسوس ناک خبر سُنائے اور اُس کو خوش کرے۔ لیکن گیدڑ یہ سارا تماشا شروع سے آخر تک دیکھتا رہا تھا۔ اُس نے کچھوے کو اپنی جانب آتے دیکھا تو دُور ہی سے بولا:

"ارے کچھوے میاں، اِتنی دُور کیسے آ گئے؟ کیا بات ہے آج؟"

کچھوے نے مُنہ بسور کر جواب دیا۔ "کیا کروں، موت کی خبر دینے آیا ہُوں۔ گیدڑ بھیّا، میرا یار مگر مچھ مر گیا۔ اب تُم اِطمینان سے پانی پیو۔ عیش کرو۔" اور وہ جھُوٹ مُوٹ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

"لیکن مُجھے تو پیاس ہی نہیں۔" گیدڑ نے جواب دیا۔

"لو بھلا، پیاس کیسے نہیں۔ اِتنی تیز دھُوپ ہے اور تُمھیں پیاس نہیں۔ واہ! بنو مت۔ جا کر اپنی پیاس بجھاؤ۔۔۔ میں آنسوؤں سے غم کی آگ بجھاتا ہوں۔" کچھوا پھر رونے لگا۔

"مگر تُمہارا یار مگر مچھ اِس وقت ہے کہاں؟" گیدڑ بھی کچھ کم چالاک نہ تھا۔

کچھوے نے اپنی ٹانگیں سُکیڑ کر اندر کر لیں اور بولا۔ "تُم نے سُنا نہیں؟ میں نے ابھی تو تُمہیں بتایا ہے۔" "نہیں۔" گیدڑ نے جواب دیا۔

کچھوا اُداس ہو کر کہنے لگا۔ "میرا یار مر گیا۔ مگر مچھ مر گیا۔ ہائے ہائے۔"

"ہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔۔" گیدڑ ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔ پھر غم گین صُورت بنا کر بولا۔ "سچ مُچ کتنے دُکھ کی بات ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ، تُمہیں یقین ہے کہ وہ مر گیا؟ میں نے اُسے اکثر مُردوں کی طرح پڑے ہُوئے دیکھا ہے۔ بعض وقت وہ پانی پر لٹھّے کی طرح بے حرکت لیٹا ہوتا ہے اور پھر ایک دم چھَپ سے پانی

میں ڈُبکی لگا جاتا ہے۔۔۔ ارے! وہ بڑا گھاگ ہے۔"

کچھوے نے یقین دِلاتے ہوئے کہا۔ "تم جو کُچھ کہتے ہو، سب ٹھیک۔۔۔ لیکن اب کے وہ سچ مُچ مر گیا ہے اور گُل مہر کے درخت کے نیچے پڑا ہے۔ میں نے اُس کی لاش پر گُل مہر کے پھُول ڈال دیے ہیں۔ اس وقت مکھّیاں اُس کی رکھوالی کر رہی ہیں۔"

"کتنی اچھّی بات ہے۔" گیدڑ نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر جلدی سے بولا۔ "تُم نے اچھا کیا کہ اُس کی لاش پر پھُول ڈال دیے۔ خیر، میں جا کر پہلے پانی پی آؤں۔ پھر اُس کی فاتحہ پڑھوں گا۔ کتنا شریف اور نیک مگرمچھ تھا۔"

"ہائے! ہائے!" کچھوا بھی ٹھنڈی آہیں بھرنے لگا۔

گیدڑ سیدھا دریا کی طرف بھاگا۔ کچھوا اُس کے پیچھے رینگتا گیا۔ گیدڑ نے کان کھڑے کر کے آوازیں سُننا چاہیں اور پھر تھوتھنی اُٹھا کر اِرد گرد اچھّی طرح سُونگھا۔ کچھ دُور مگرمچھ گُل مہر کے درخت کے نیچے پھُولوں کے ڈھیر تلے پڑا تھا اور اُس پر مکھّیاں بیٹھی تھیں۔

کچھوا رینگتا ہُوا گیدڑ کے قریب پُہنچا تو گیدڑ نے ایک آنکھ بند کر کے اُس کے کان میں کہا:

"حیرت ہے۔۔۔۔"

"کیسی حیرت، بھائی؟" کچھوے نے دریافت کیا۔

گیدڑ نے گُل مہر کے درخت کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ عجیب بات نہیں کہ مگرمچھ اپنی دُم تک نہیں ہلاتا۔"

"لو! اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ مرا ہوا ہے۔ دُم کیسے ہلائے؟" کچھوے کو گیدڑ کی بات پر غصّہ آ گیا۔ "حیرانی کی بات تو یہی ہے۔ مُجھے تو اب تک یہی پتا تھا کہ مُردہ مگرمچھ دُم ہلاتا رہتا ہے۔۔۔۔ اگر تُم کہتے ہو تو یقین کر لیتا ہُوں۔ ویسے یہ مرا ہُوا ہرگز نہیں۔"

مگرمچھ اب تک سانس روکے گیدڑ اور کچھوے کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس نے اچانک اس زور سے دُم ہلائی کہ ساری مکھّیاں بھِنبھنا کر اُڑ گئیں۔ گیدڑ چلّایا۔ "یہ

مرا ہُوا ہے۔۔۔ہاہا! ہاہا! یہ مرا ہُوا ہے۔"

پھر قہقہے لگاتا ہوا جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

اب مگرمچھ کے لیے مکر کرنے کی کیا گنجائش رہ گئی تھی۔ وہ رینگتا ہوا دریا میں اُتر گیا اور سارا الزام کچھوے پر لگایا کہ اُسی نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

اب تو کچھوا بہت ڈرا۔ اُس نے خیریت اِسی میں جانی کہ مگرمچھ کی دوستی کو خیر باد کہہ کر کہیں دُور چلا جائے۔

اب مگرمچھ دریا میں تنہا رہتا ہے۔ کوئی بھی اُس کے پاس نہیں پھٹکتا۔

چوہے کی دلہن

کِسی گاؤں میں ایک کسان اور اُس کی بیوی رہتے تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ہر شام جب کسان کھیت میں دن بھر کی محنت سے فارغ ہوتا تو ہل کی ہتھّی کو تھام کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہتا:

"میرے تمام ہمسایوں کے بیٹے ہیں۔ جب وہ بوڑھے ہو جائیں گے تو بیٹے فصل بوئیں گے، کاٹیں گے۔ لیکن میرا کوئی بیٹا نہیں۔ میری زمین کا کیا بنے گا؟ کاش میرا بھی کوئی بیٹا ہوتا۔ ایک بیٹا اپنی رحمت سے مُجھے دے، خُدایا۔"

وہ ہر شام گھر جانے سے پہلے یہ خواہش ضُرور کرتا۔ اس شام بھی وہ اپنی یہ خواہش دُوہرا رہا تھا کہ اُس کے سر کے اُوپر سے ایک باز گُزرا۔ اُس نے بوڑھے کو اسی طرح ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگتے دیکھا تو حیران ہُوا۔ حیرانی کے عالم میں اُس نے اپنے پَر پھیلا دیے۔ ان پَروں میں سے ایک چُوہا نیچے گِرا۔ ننّھا مُنّا سا چُوہا۔

کسان نے اُسے اُٹھا کر ہتھیلی پر رکھ لیا اور پوچھا۔ ”کیوں مُنّے؟ کہاں سے آئے ہو؟“

”جناب، آسمان سے۔“ چُوہے نے چِیں چِیں کر کے جواب دیا۔

”کیا تُم میرے گھر چلو گے؟“ کسان نے پُوچھا۔

”جی ہاں۔ اگر آپ پسند فرمائیں۔“ چُوہے نے ادب سے جواب دیا۔

”اچھا چُوہے بیٹے، کیا تم ہل چلانا، بیج بونا اور فصل کاٹنا سیکھو گے؟“ کسان نے سوال کیا۔

”واہ! یہ تو میں پہلے سے جانتا ہوں۔“ چُوہے نے کہا۔

کسان چُوہے کو اپنے گھر لے گیا اور صحن میں پڑی ہُوئی چوکی پر بٹھا دیا۔ کسان کی بیوی کام کاج سے فارغ ہو کر صحن میں آئی تو اُس کی چِیخیں نِکل گئیں۔

”دیکھو! میاں، دیکھو!“ اُس نے ساری کا پلّو مُنہ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو چوکی پر چوہا بیٹھا ہے۔“

"بیوی، یہ ہمارا بیٹا ہے۔" کسان نے اُسے بتایا۔

"ہمارا بیٹا؟ چُوہا؟" بیوی حیرت سے چلّائی۔

"یہ ننّھی مخلوق آسمان سے ٹپکی ہے۔" کسان نے بتایا۔

چُوہا بے چارا ڈر سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس نے پُوچھا۔ "یہ کیوں چیخ رہی ہے؟" کسان نے جواب دیا۔ "بیٹا، اسے تُمہارے آنے کی اُمّید نہ تھی۔ تُمہارے اچانک آ جانے سے بے چاری حیران ہو رہی ہے۔" پھر وہ بیوی کی طرف بڑھا اور اُسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا:

"بس بس۔ بُہت حیران ہو لیں۔ ہُوش میں آؤ۔ یہ ہمارا بیٹا ہے اور اب ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ اسے پیار کرو۔"

کسان کی بیوی نے چُوہے کو گلے لگا کر پیار کیا۔ پھر کھانا کھلا کر بستر پر لٹا دیا۔

صُبح ہوئی تو کسان کی بیوی نے چھُوٹا سا لال کوٹ پہنا دیا اور وہ خُوشی خُوشی کسان کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے چلا گیا۔ چُوہے نے جو یہ کہا تھا کہ وہ ہل چلانے

سے لے کر بُوائی کٹائی تک سب کچھ کر سکتا ہے، تو یہ سچ ہی کہا تھا۔ اس نے ہر کام بڑی مہارت سے کیا۔ بلکہ کسان سے بھی بہتر طریقے سے کیا۔ کام کرتے ہُوئے اُسے تھکاوٹ کا بھی احساس نہ ہوتا تھا۔ صُبح سے جو ہل چلانا شروع کرتا تو رات ہو جاتی، مگر اُس کا ہاتھ ہل کی ہتھّی کو مضبُوطی سے پکڑے رکھتا۔ پھر اچانک کسان اُسے آواز دیتا:

"بس کرو بیٹا۔ رات ہونے کو آئی۔ اب گھر چلو۔"

چُوہا، ہل چلاتے چلاتے رُک کر آسمان کی طرف مُنہ اُٹھاتا اور کہتا:

"ابّا، میں ابھی ہل چلا سکتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"لیکن بیٹا، اُدھر دیکھو۔ ہمسایوں کے بیٹے رات کا کھانا کھانے گھر جا چُکے ہیں۔"

"کیا سچ مُچ؟ واقعی۔ کھیت خالی پڑے ہیں۔" چُوہا چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہتا۔

یہ اس کا ہر روز کا معمول تھا کہ شام کے سائے گہرے ہونے تک ہل چلاتا یہاں

تک کہ ہمسائیوں کے کھیت خالی ہو جاتے۔ گھر واپس آتا تو خُوشی سے اُچھلتا کُودا اور گا گا کر اپنے باپ کا جی بہلاتا۔

کسان کو اپنے اس بیٹے پر بڑا ناز تھا۔ وہ کام کر کے خُوش ہوتا تھا۔ اُس پر کسان جتنا بھی فخر کرتا بجا تھا۔

چند سال اسی طرح گُزر گئے۔ پھر چُوہے کی خُوشی غائب ہونے لگی۔ اب وہ نہ چہکتا تھا، نہ گاتا تھا۔ کھیت میں پہلے کی طرح ہل چلاتا اور شام ڈھلے گھر لوٹتا۔ لیکن پہلی سی خُوشی اور جوش بالکل ختم ہو چکا تھا۔

یہ دیکھ کر کسان کو فکر ہوئی۔ لیکن اُس کی بیوی نے، جو ہل اور کھیتوں کے علاوہ بھی بُہت کچھ جانتی تھی، اندازہ لگایا کہ بات کُچھ اور ہے۔

رات کو جب چُوہا گہری نیند سو گیا تو اُس نے گز اُٹھا کر چُوہے کی دُم ناپی۔

"بیوی، تُم اس کی دُم کیوں ناپ رہی ہو؟" کسان نے پُوچھا۔

"ہش۔۔۔!" بیوی نے مُنہ پر اُنگلی رکھ کر خاموش رہنے کے لیے کہا۔ "ابھی بتاتی

ہوں۔ ہاں، ٹھیک۔۔۔ سات انچ۔۔۔ سات انچ لمبی ہو گئی۔۔۔۔ میاں، تِین ستّے کتنے ہوتے ہیں؟"

کسان نے لمحہ بھر کو سوچا۔ "تین ستّے۔۔ ہُوں۔۔۔ تین ستّے اکّیس ہوتے ہیں۔" کسان نے جواب دیا۔

" ہاں ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" کسان کی بیوی نے کہا۔ "ہمارا چُوہا بیٹا اب اِکّیس برس کا جوان بن گیا ہے۔"

"جوان بن گیا ہے۔" کسان خُوشی سے چِلّایا "تو اُداس کیوں رہتا ہے؟"

کسان کی بیوی نے گز ایک طرف رکھ دیا اور کہا۔ "اس لیے اداس رہتا ہے کہ اب اُس کی شادی کی عُمر ہو گئی ہے۔ اب اُس کے لیے گھر والی چاہیے۔"

یہ باتیں کرتے ہوئے وہ چُوہے کی طرف دیکھ رہے تھے جُو بڑے مزے سے خرّاٹے لے رہا تھا۔

"دُلہن ہی کا چکّر ہے نا؟ لو، میں کل ہی تلاش شُروع کر دوں گا۔" کسان نے کہا۔

"ہاں۔ ضُرور۔ کل ہی۔ لیکن اِتنا یاد رکھنا کہ ہمارے بیٹے کی دُلہن گاؤں کی سب سے اچھّی لڑکی ہو۔"

کسان اور اس کی بیوی اس وقت چُولہے کے سامنے بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ بیوی کی بات سُن کر کسان اپنا مُنہ اُس کے کان کے پاس لے گیا اور ہولے سے بولا:

"بس، جیسا ہمارا بیٹا ہے، ویسی ہی دُلہن ہونی چاہیے۔ نہ بہُت بُری، نہ بہُت بھلی۔"

اگلے دن کسان اور اس کا چُوہا بیٹا خُوب بن ٹھن کر دُلہن کی تلاش میں نِکل کھڑے ہوئے۔ سارا دِن گھومتے رہے، لیکن کوئی دُلہن نہ مِلی۔ سورج غروب ہو گیا تو دونوں تھک ہار کر ایک پتھّر پر بیٹھ گئے۔ بے چارے کسان کا تو بُرا حال تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ پسینا ٹپک رہا تھا۔ چُوہے کو بھی تھکن کے مارے جمائیاں آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد آسمان پر چاند رچمکنے لگا۔ یہ چودھویں کا چاند تھا۔ اس کے حُسن اور نُور نے کسان کی آنکھوں کو چُندھیا دیا۔ اُس نے چُوہے سے کہا:

"دیکھو۔ اِدھر دیکھو، بیٹا۔ میرے خیال میں صرف چاند کی بیٹی ہی تُمہاری دُلہن بننے کے قابل ہے۔ بولو، کیا خیال ہے؟"

چُوہا کافی دیر آنکھ جھپکے بغیر چاندنی کی طرف دیکھتا رہا۔ چاندنی سچ مُچ بُہت حسین تھی۔ بُہت چمک دار تھی۔ لیکن اُس کو کُچھ زیادہ پسند نہ آئی۔۔۔ اُس نے باپ سے کہا:

"ابّا، اِس میں شک نہیں چاند کی چاندنی بے حد حسین ہے، لیکن یہ تو ٹھنڈی اور مغرُور دِکھائی دیتی ہے۔"

"ہاں ہاں۔ میں ٹھنڈی اور مغرُور ہوں۔ میں تُمہارے لیے ہر گز نہیں ہوں۔" چاندنی نے حقارت سے کہا۔

کسان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چاندنی سے بُولا۔ "چندا رانی، مُجھے بس اتنا بتا دو، کیا دُنیا میں تُم سے زیادہ حسین بھی کوئی ہے؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔" چاندنی نے جواب دیا۔ "بادل کی بیٹی بدلی مُجھ سے کہیں زیادہ

خوب صُورت ہے۔ جب وہ میرا چہرہ اپنے آنچل سے ڈھانپ دیتی ہے تو میں چھُپ جاتی ہُوں۔۔۔ سو، وُہ مُجھ سے بہتر ہے۔۔۔۔ میرا تو یہی اندازہ ہے۔"

اُسی وقت کہیں سے تیرتی ہوئی ایک بدلی آئی اور اُس نے چاند کو چھُپا دیا۔ اب وہ کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔

"اُدھر دیکھو بیٹا، یہ دُلہن تُمہارے لائق ہے۔ کیا تُمہیں پسند ہے؟"

"ہے تو بُہت اچھی۔" چُوہے نے جواب دیا۔ پھر رُک کر بولا۔ "لیکن بُہت اُداس اور غم زدہ نظر آتی ہے۔"

"ہاں، وہ تو میں ہوں۔" بدلی نے اُداسی سے کہا۔ "میں تُمہارے لیے نہیں ہُوں۔"

"اے بدلی رانی، مُجھے بتاؤ، تُم سے بہتر بھی کوئی ہے؟" کسان نے وہی سوال بدلی سے کیا جو اُس نے چاندنی سے کیا تھا۔

"ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔ ہوا مُجھ سے کہیں بہتر ہے۔" بدلی نے کہا۔ "ہوا مُجھے

آسمان میں دوڑاتی پھرتی ہے۔ وہ مُجھ سے اچھّی ہے۔"

اُسی وقت ہوا کے تیز جھونکے آئے اور بدلی کو تِتّر بتّر کر دیا۔

کسان نے سوچا، آخر کار اُس کے بیٹے کو اچھّی دُلہن مل ہی گئی۔ اُس نے چُوہے سے پُوچھا: "ہوا کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں سمجھتا ہُوں، یہی تُمہارے قابل ہے۔ کیوں بیٹا؟"

چُوہا اُس وقت سردی سے کانپ رہا تھا۔ اُس نے جواب دیا۔ "ہوا نے تو میری مونچھیں ہلا کر رکھ دیں۔ ہوا ہے تو اچھّی، مگر ہے کُچھ آوارہ۔"

"ہاں ہاں۔ میں آوارہ ہُوں۔" ہوا نے سیٹی بجا کر کہا۔ "میں تُمہارے قابل نہیں۔"

کسان نے ہوا سے بھی وُہی سوال کیا۔ "ہوا رانی، مُجھے یہ بتاؤ کہ تُم سے اچھّی بھی کوئی چیز ہے؟"

"مُجھ سے اچھّی پہاڑی ہے۔" ہوا نے جلدی سے جواب دیا۔ "میں کتنی ہی تیز

چلوں، یہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔"

کسان اور چوہے نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک پہاڑی کے پاس بیٹھے تھے۔ کسان نے سُکھ کا سانس لیا اور بولا:

"شکر ہے۔ آخر کار ہمیں تُمہارے لیے دُلہن مل ہی گئی۔ بولو بیٹا، کیسی ہے؟ پسند آئی؟"

"جی ابّا جان۔ ہے تو بڑی شریف، مگر لگتا ہے ضدّی ہو گی۔""افسوس! افسوس!" کسان نے افسردگی سے کہا۔ "بیٹا، معلُوم ہوتا ہے کہ ہمیں تُمہاری دُلہن کبھی نہیں مِلے گی۔" پھر وہ پہاڑی سے بولا:

"پہاڑی رانی، کیا تُم سے بہتر کوئی نہیں؟"

اس پر پہاڑی میں گرج پیدا ہوئی اور آواز آئی۔ "مُجھ سے بھی اچھّی ایک چیز ہے۔ بس تُم مُجھے کھودنا شروع کر دو۔ تُمہیں اپنے بیٹے کے لیے دُلہن مل جائے گی۔"

کسان نے پھاوڑے سے اور چُوہے نے اپنے پنجوں سے پہاڑی کو کھودنا شروع کر دیا۔ کُچھ دیر بعد پہاڑی میں ایک سوراخ ہو گیا۔ وہ اُس سوراخ کو کھودتے گئے۔ اچانک پہاڑی پھر گونجی:

"سُنو سُنو! تُم لوگ بہرے تو نہیں ہو گئے؟" دونوں کام چھوڑ کر سُننے لگے۔

"مجھے تو کُچھ بھی سُنائی نہیں دیتا۔" کسان نے کہا۔

"اپنے کان زمین سے لگا دو۔" پہاڑی نے کہا۔

باپ بیٹے نے کان زمین سے لگا دیے۔ چُوہے کے کان بڑے تیز تھے۔ اُسے زیادہ سُنائی دیتا تھا۔

"میں کُچھ سرسراہٹ سی سُن رہا ہُوں۔" چوہے نے بڑے جوش سے کہا۔ کسان بھی کان لگا کر سُننے گا۔

"ہاں، مُجھے بھی آواز آ رہی ہے۔" کسان نے کہا۔ "یوں لگتا ہے جیسے کوئی کسی چیز کو کھُرچ رہا ہو۔"

"یہی تو میں بتا رہی تھی۔" پہاڑی نے کہا۔

کسان اور چُوہے نے تیزی سے کھودنا شروع کیا۔ اب دوسری طرف سے آنے والی آواز زیادہ صاف سُنائی دے رہی تھی۔ سر سر سر۔۔۔ اب اُن کے سامنے ایک بڑا سا سوراخ تھا جو سیدھا پہاڑی کے سینے تک جاتا تھا۔

باپ بیٹا دونوں سوراخ میں مُنہ ڈال کر سرگوشی میں بولے۔

"باہر آجاؤ۔۔۔ باہر آجاؤ۔۔۔ تُم جو بھی ہو، باہر نِکل آؤ۔"

پلک جھپکتے میں اُن کے سامنے ایک مُنّی سی چُوہیا کھڑی تھی۔ اس نے بھُورے رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا اور ماتھے پر شبنم کی بُوند کا ٹیکا چمک رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ کسان اپنے بیٹے سے چُوہیا کے بارے میں کوئی رائے پُوچھتا، چُوہے نے دونوں پنجے اُٹھا کر کہا: "ابّا، اب کچھ نہ کہنا۔" یوں لگتا تھا جیسے اُس پر کِسی نے جادُو کر دیا ہو۔ "یہی وہ لڑکی ہے جو میری دُلہن بن سکتی ہے۔"

پھر تینوں مل کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ کسان کی آنکھوں میں حیرت اور

خُوشی کی چمک تھی اور وہ دُولہا دُلہن کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

ایک بوند شہد

بہت عرصہ ہوا، ہندوستان کی کِسی ریاست پر ایک راجا راج کرتا تھا۔ وہ سُوریہ پرتاپ خاندان سے تھا، جس کا مطلب ہے "سورج جیسا طاقت ور۔" اگرچہ راجا سُورج جتنا طاقت وَر تو نہیں تھا مگر وہ اپنے آپ کو سمجھتا یہی تھا جیسے سچ مُچ کا سورج ہو۔

وہ اِتنے رُعب داب والا تھا کہ کِسی کو اُس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اپنی بات پر ڈٹے رہنا اُس کی عادت تھی۔ اگر کوئی اس کی خواہش کے خلاف کام کرتا تو اُسے کڑی سزا دیتا، چاہے وُہ اُس کا قریبی دوست اور درباری ہی کیوں نہ ہو۔

اس راجا کے وزیر کا نام دِھیر سل تھا۔ دِھیر سل پر راجا کو بے حد بھروسا تھا۔ وہ اکثر اس سے راز کی باتیں کر لیا کرتا تھا، اور پُوری ریاست میں وہی ایسا شخص تھا

جس پر راجا مہربان تھا (دِھیر سل کا مطلب ہے، صابِر یعنی صبر کرنے والا)۔

لوگ دِھیر سل کی بُہت عزّت کرتے تھے۔ اُس کے دُشمن یہ جانتے تھے کہ اُس نے جو کُچھ بھی حاصل کیا، ایمان داری سے حاصِل کیا۔ خُوب صُورت محل، اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور نوکروں کی فوج، ہیرے جواہرات وغیرہ اس کی محنت اور اِیمان داری کا صِلہ تھا۔

ان تمام قیمتی چیزوں میں سے سب سے زیادہ قیمتی چیز اُس کی بیوی تھی، جس کا نام بُدھ متی تھا۔ بُدھ متی کا مطلب ہے، عقل مند۔ اگر کوئی دِھیر سل سے پُوچھتا کہ تُم نے کامیابیاں کیوں کر حاصل کیں تو وُہ بے جھجک کہہ دیتا کہ یہ سب بُدھ متی کی بدولت ہے۔ وہ میری بہترین ساتھی اور صلاح کار ہے۔ میں اُس کے بغیر شاید کُچھ بھی حاصل نہ کر سکتا۔

ایک رات چاندنی خوب نِکھری ہوئی تھی۔ دِھیر سل بُدھ متی کے ساتھ اپنے باغ کے محل میں بیٹھا تھا۔ دونوں کافی دیر خاموش رہے۔ پھر دِھیر سل اچانک بُدھ متی کو مخاطَب کر کے بولا: ”فرض کرو، ہماری ساری دولت ختم ہو جائے تو؟“

بُدھ متی نے فوراً بات کاٹی اور حیرت سے پُوچھا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ کیا آج دربار میں کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے؟"

"نہیں۔۔۔" دِھیر سل نے جواب دیا۔ "لیکن مُجھ پر راجا کی مہربانیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ جس سے دربار میں کئی لوگ مُجھ سے حسد کرنے لگے ہیں۔"

"لیکن راجا آپ کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپ حاسدوں کی پروا نہ کریں۔ جلنے والے جلا کریں۔" بُدھ متی نے شوہر کو تسلّی دی۔

"راجا کی بھی خُوب کہی۔ وہ اِتنا شکّی مزاج ہے کہ حد نہیں۔ اگر کُچھ ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔۔۔" دِھیر سل نے بیوی کر سمجھایا۔

بُدھ متی فوّارے کے کنارے بیٹھی تھی۔ شوہر کی بات سُن کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کِسی گہری سوچ میں گُم تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد بولی:

"سچ بتایئے۔ کیا دربار میں سچ مُچ آپ کے خلاف سازش ہو رہی ہے؟"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔۔" دِھیر سل نے جواب دیا۔ "لیکن بُدھ متی۔ تُم راجا کے

مزاج کو جانتی ہو۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ بڑا جذباتی انسان ہے۔"

"آہ۔۔۔" بُدھ متی صرف آہ بھر کر رہ گئی۔ وزیر نے اپنی بات جاری رکھی:

"کل ہی کی بات ہے، میرے کِسی دُشمن نے میرے خلاف راجا کے کان بھرے تو راجا نے اُس کے کان کٹوا دیے۔ آج پھر کوئی میرے خلاف بولا تو راجا نے اُسے اندھے کنویں میں پھنکوا دیا۔ لیکن بُدھ متی، اتنا یاد رکھو کہ تنکا خواہ کتنا ہی کمزور ہو، ہوا کا رُخ بتا دیتا ہے۔ میں نے آج راجا کے مزاج میں تبدیلی دیکھی ہے۔ اس کی آنکھیں چیتے کی طرح دہک رہی تھیں، جیسے وہ مُجھ میں کُچھ کھوجنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

بُدھ متی نے شوہر کا دامن پکڑا کر کہا۔ "بہتر ہے کہ ہم یہاں سے فرار ہو جائیں۔"

"کیوں؟" وزیر کو بیوی کی اس حرکت پر حیرت ہوئی۔

"اس لیے کہ یہ جگہ اب محفُوظ نہیں۔" بُدھ متی نے بھرّائی ہُوئی آواز میں

جواب دیا۔ وزیر نے بیوی کے خوف کا مذاق اُڑایا اور ہنس کر کہا۔ ”بُدھ متی، کیا تُم بھُول گئیں کہ میں نے تُم سے کیوں شادی کی تھی۔“

بُدھ متی نے مُڑ کر شوہر کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ ہنس رہا تھا اور ذرا بھی خوف زدہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ بُدھ متی کے ہونٹوں پر بھی مُسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”میں جانتی ہُوں، آپ نے مُجھ سے شادی کیوں کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک اس معمّے کو سمجھ نہیں سکی۔“

وزیر اپنی جگہ سے اُٹھا اور بیوی کو سہارا دیتے ہُوئے ہولے سے بولا:

”میں نے تُم سے اس لئے شادی کی تھی کہ تُم خُوب صُورت ہونے کے علاوہ سمجھ دار بھی ہو۔ آج میں یہ سوچ رہا ہُوں کہ تُمہاری عقل ہی وہ قیمتی چیز ہے جِس کے ہم دونوں مالک ہیں۔ باقی کچھ بھی ہمارا نہیں۔“ دِھیرسل کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر بولا:

”بُدھ متی، مُجھے کِسی دُشمن کی پروا نہیں۔ مُجھے راجا کی بدمزاجی کا بھی خوف نہیں۔

لیکن ہمیں آنے والی مُصیبتوں کے لیے تیّار رہنا چاہیے۔"

دِھیر سل کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کُچھ نہ کُچھ ہونے والا ہے۔ درباری اُس کے خلاف راجا کے کان بھرتے رہتے تھے۔

راجا دو تین روز دِھیر سل کو غصّے سے دیکھتا رہا اور اس کو بد تمیزی سے بُلاتا رہا لیکن پھر جیسے اچانک آسمان سے بجلی ٹُوٹ پڑی۔ راجا نے دِھیر سل کو ایسا غلط کام کرنے کا حکم دیا جس کو سُنتے ہی دِھیر سل چیخ اُٹھا:

"نہیں۔۔۔۔"

دِھیر سل نے درباری آداب کی بالکُل پروانہ کی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ راجا نے گرج کر پُوچھا:

"نہیں؟ میرے سامنے نہیں کی جُرأت کون کر سکتا ہے؟"

اُسی لمحے درجنوں ہاتھ تلواروں کے دستے سنبھالنے لگے۔ لیکن دِھیر سل جہاں کھڑا تھا، کھڑا رہا۔ وہ وزیر کا شاندار چُغہ پہنے ہُوئے تھا اور بڑا رُعب دار لگ رہا تھا۔

قتل کرنے والوں کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رُک گئے کیوں کہ دِھیر سل کے ہاتھ میں بھی تلوار تھی، اور وہ تلوار کا دھنی تھا۔ اس پر حملہ کرنے والا خُود موت کے گھاٹ اُتر جاتا۔

یہ دیکھ کر راجا بے چین ہو گیا۔ اُسے سخت غصّہ آ رہا تھا۔ وہ اپنی من مانی کرنا چاہتا تھا لیکن وزیر کو جان سے مار کر وُہ اس کام کو کروا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے پھر اپنی بات دُہرائی۔ اب اُس کے لہجے میں کِسی قدر نرمی تھی۔

"میرے سامنے نہیں کون کہہ سکتا ہے؟"

راجا کو اُمّید تھی کہ اِس طرح دِھیر سل کُچھ دھیما پڑ جائے گا اور اُس کے سامنے جھُک جائے گا۔ لیکن وزیر کی طرف ایک نگاہ ڈالنے ہے ہی اُسے اندازہ ہو گیا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے، کیوں کہ دِھیر سل چٹان کی طرح مضبُوط اِرادہ لیے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پچھتاوے کے کوئی آثار نہ تھے۔

راجا سختی سے پھُنکارنے لگا۔ اُس کے مُنہ سے پُورے الفاظ نہ نکلتے تھے۔ اُسے اپنے اُوپر قابو پانا مُشکل ہو رہا تھا۔ اس نے بادل کی طرح گرج کر وزیر سے کہا:

”جو شخص میرا حکم نہ مانے اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن دِھیر سل، یاد رکھو، تُم آہستہ آہستہ میری نظروں میں چڑھے تھے، اس لیے تمہیں آہستہ آہستہ ہی مارا جائے گا تا کہ تُمہیں محسوس ہو کہ تم نے میرا حکم نہ مان کی کتنی بڑی غلطی کی ہے۔“

”مہاراج۔“ وزیر نے دھیمی آواز میں کہنا شُروع کیا۔ ”آپ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔ لیکن میں اِتنا جانتا ہوں کہ یہ سوچ کر آپ عُمر بھر پچھتاتے رہیں گے کہ آپ نے ایک ایسے شخص پر ظلم کیا جس نے آپ کا غَلَط حکم ماننے سے اِنکار کر دیا تھا۔“

وزیر کی اِس گُستاخی پر راجا آپے سے باہر ہو گیا اور غصّے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ پھر اُس نے پہرے داروں کو بُلایا اور حکم دیا کہ دِھیر سل کو گرفتار کر کے شہر سے باہر بنے ہُوئے مینار کی چھت پر قید کر دیا جائے۔ اس کو پینے کے لیے ایک بوند پانی اور کھانے کو ایک لُقمہ نہ دیا جائے اس کے سر پر کسی قسم کا سایہ نہ ہو تا کہ جیٹھ اساڑھ کی تیز دھوپ اُسے تڑپا تڑپا کر مار دے۔“

پہرے دار دِھیر سل کے ہتھکڑی لگانے سے ہچکچا رہے تھے۔ اُس کا اِتنا رُعب اور دبدبہ تھا کہ کِسی کو آگے بڑھنے کی جُرأت نہ ہو رہی تھی۔ انہیں ہچکچاتا دیکھ کر دِھیر سل بولا:

"جھجکتے کیوں ہو؟ میں خُوشی خُوشی تُمہارے ساتھ چلوں گا۔ راجا کا کام ہے حکم دینا اور ہمارا کام ہے اس حکم کو ماننا۔"

یہ کہہ کر اس نے راجا کو جھک کر سلام کیا اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ اس کے چہرے پر خوف یا پریشانی کے آثار نہ تھے۔ وہ بالکل پُر سکون تھا۔

لیکن اُس کے دل میں ایک خیال آ رہا تھا۔ "بُدھ متی کا کیا ہو گا؟ آج شام میں جب گھر نہیں لوٹوں تو وہ کیا سوچے گی؟"

بُدھ متی کو پیغام بھجوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کِس کے ہاتھ پیغام بھیجے؟ سب راجا کے بندے تھے اور راجا اُس کا دُشمن تھا۔ بُدھ متی دِھیر سل کا اِنتظار کرتی رہی، یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ پھر وہ باغ میں چلی گئی۔ بیٹھے بیٹھے کئی گھنٹے گُزر گئے اور پھر دِن نِکل آیا۔ اب وہ سمجھ گئی کہ اُس کا شوہر کِسی مُصیبت میں

گرفتار ہو گیا ہے۔ اُس نے چادر اوڑھی اور محل کے دروازے سے باہر نِکل گئی۔۔۔ دِن کا اُجالا پھیل چُکا تھا۔ سقّے سڑک پر چھڑکاؤ کرنے کے بعد آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک بوڑھا سقّہ اُونچی آواز میں کُچھ بتا رہا تھا۔

بُدھ متی چلتے چلتے رُک گئی۔ اُس نے سوچا شاید یہ بُوڑھا سقّہ ہی کُچھ جانتا ہو۔ وُہ اوٹ میں ہو گئی تا کہ کِسی کو نظر نہ آئے اور کان ان سقّوں کی گُفتگو پر لگا دیے۔ بُوڑھا پھٹی ہُوئی آواز میں کہہ رہا تھا:

"آہ! غرُور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ دیکھا، وزیر کِس رُتبے پر تھا اور کیسے نیچے گِرا۔۔۔ خُدا رحم کرے۔"

دُوسرے سقّے نے کہا۔ "کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ پھِر اِسی رُتبے پر آ جائے گا۔"

اِس پر بُوڑھا سقّہ زور سے ہنسا۔ پھر بولا: "واہ بھئی، خُوب کہی۔۔۔ اُونچے مقام پر تو وہ پُہنچ گیا۔ اس وقت وہ اُونچی جگہ پر ہے۔۔۔ ہی ہی۔۔۔ کیا خُوب کہی تُم نے۔۔۔ ہاہاہا"!

بُدھ متی کو یُوں لگا جیسے وُہ چکرا کر گِرنے والی ہے۔ اُسے وہم سا ہُوا کہ راجا نے دِھیر سل کو پھانسی پر لٹکا دیا ہے۔

بُوڑھے سقّے کی بات جاری تھی اور وہ کھانس کھانس کر کہہ رہا تھا:

"اصل قصّہ یہ ہے کہ اس دن راجا بے حد غصّے میں تھا۔ اس نے وزیر کو ایک بُہت ہی غلَط کام کرنے کا حکم دیا۔۔۔"

"پھر کیا ہُوا؟" سُننے والوں میں سے ایک نے بے صبری سے سوال کیا۔ شوق کے مارے اُس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔

"وزیر نے کہا، نہیں۔" بوڑھے سقّے نے بتایا۔

"راجا کے سامنے نہیں کہہ دیا؟" سقّوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

بُوڑھے نے کہا "وزیر نے اپنے حواس قابُو میں رکھے۔ وہ بالکل نہیں گھبرایا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی زندگی کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ بڑی جُرأت سے راجا کی طرف مُڑا اور اُسے اس طرح مُخاطب کیا جیسے کوئی باپ اپنے شریر بیٹے کو مُخاطب

کرتا ہے۔ واہ! کیا حوصلہ ہے۔ کیا جُرأت ہے۔" بُوڑھا کہتے کہتے خیالوں میں کھو گیا۔

سُننے والوں کی بے چینی دیکھنے سے تعلّق رکھتی تھی۔ اُن کی آنکھیں اور کان بُوڑھے کی طرف لگے تھے۔ اُن میں سے ایک بے صبری سے بولا:

"بڑے میاں، سزا کیا ملی وزیر کو؟"

بُدھ متی نے کانوں پر لپٹی ہوئی چادر کو پیچھے سرکا دیا اور پوری توجّہ سے بوڑھے کی آواز کی طرف لگا دی۔ بوڑھے نے کہنا شرُوع کیا:

"میں نے بتایا تو ہے کہ وزیر اس وقت سب سے اُونچی جگہ پر ہے، کیوں کہ وہ شہر سے باہر اُونچے مینار کی چھت پر قید ہے۔ اُسے کھانے پینے کے لیے کُچھ نہیں ملے گا اور تیز دھوپ اُس کا بھیجا پگھلا کر رکھ دے گی۔"

"راجا کے سامنے نہیں کہنے کا مزا جلد ہی چکھ لے گا۔" سقّوں میں سے ایک نے سر ہلا کر کہا۔ اب بُدھ متی زیادہ دیر وہاں نہیں رُک سکتی تھی۔ اُس نے سوچا، اب

وُہی کِسی ترکیب سے شوہر کی جان بچائے تو بچائے ورنہ اُس کا بچنا بُہت مُشکل ہے۔ اُس کے سامنے پہاڑ سا دِن پڑا تھا۔ دن کے وقت وہ مینار کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔ وہ تمام دِن ترکیبیں سوچتی رہی۔ غم نے اُسے نڈھال کر دیا۔ آخر پل پل کر کے سُورج ڈھلا۔ رات ہُوئی۔ چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔

جب آدھی رات ہُوئی تو بُدھ متی نے چادر لپیٹی اور چُھپ چھُپا کر محل کے دروازے سے نکلی۔ وُہ شہر کی گلیوں اور بازاروں سے ہوتی ہُوئی اُس سڑک کی طرف چل دی جو مینار کی طرف جاتی تھی۔ سارا شہر سویا ہُوا تھا۔ بازار سُونے پڑے تھے۔ کہیں کہیں کُوڑے کے ڈھیروں پر آوارہ کُتّے اور بلّیاں خوراک کی تلاش میں مُنہ مارتے پھر رہے تھے۔

مِینار کو جانے والی سڑک بُہت لمبی تھی۔ بُدھ متی نے اپنی چال کہیں بھی آہستہ نہیں کی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ ایک لمحے کی دیر سے اس کے شوہر کی زندگی ختم ہو سکتی تھی۔ وہ مِینار کے پاس پہنچی تو تڑکا ہو چُکا تھا، مگر ابھی سُورج نہیں نِکلا تھا۔ بُدھ متی نے دیکھا کہ دِھیر سل مینار کی چھت پر بنے موٹے جنگلے کے سہارے

کھڑا ہے۔ بُدھ متی نے آہستہ سے کہا۔ ”میں آ گئی ہوں۔ آپ کی بیوی، بُدھ متی۔“

وزیر نے چونک کر جواب دیا۔ ”مجھے یقین تھا تُم آؤ گی، اور مُجھے اس تخت پر بیٹھا ہُوا پاؤ گی۔“

”آپ حُکم کیجیے۔ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔“ بُدھ متی نے جلدی سے کہا۔

”بُدھ متی، صرف تُم ہی میری مدد کر سکتی ہو۔“

وزیر بولا۔ ”غور سے سُنو۔ کل اسی وقت کُچھ چیزیں لے کر یہاں پہنچ جاؤ۔“

”کہیے؟“ بُدھ متی دِھیر سل کا ایک ایک لفظ غور سے سُن رہی تھی تا کہ کوئی بات رہ نہ جائے۔

”سب سے پہلے ایک بھونرے کی ضرُورت ہے۔“ دِھیر سل نے بتایا۔

”بھونرا۔۔۔!“ بُدھ متی کا مُنہ حیرت سے کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔

”ہاں ہاں، بھونرا۔“ دِھیر سل نے دوہرایا ”اور سُنو۔ ساٹھ گز لمبا ریشم کا دھاگا۔

یہ دھاگا مکڑی کے تار کی طرح باریک ہونا چاہیے۔ مگر مضبُوط اِتنا ہو جیسے رسّی۔"

"اچھّا۔ ساٹھ گز ریشم کا دھاگا۔" بُدھ متی نے دوسرا یا، جیسے سبق دُوہرا رہی ہو۔

"ساٹھ گز سُوتی دھاگا۔" دِھیر سل کہتا چلا گیا۔

"جی، ساٹھ گز سُوتی دھاگا۔" دِھیر سل نے کہا۔

"سُوتی دھاگا بھی مضبُوط ہونا چاہیے۔" شوہر نے تاکید کی۔ "اور ساٹھ گز مضبُوط ڈوری۔ سمجھیں؟"

"سمجھی۔۔۔ ساٹھ گز مضبُوط ڈوری۔" بُدھ متی نے جواب دیا۔

"ٹھیک۔ بالکل دُرست۔ اِس کے عِلاوہ ساٹھ گز لمبا رسّا۔ رسّا اِتنا مضبُوط ہو کہ میرا بوجھ سہار سکے۔" وزیر نے بتایا۔ پھر بولا "بُدھ متی، ان میں سے کوئی چیز نہ بھُولنا۔"

بُدھ متی نے کہا۔ "نہیں بھُولوں گی۔ سب چیزیں لاؤں گی۔"

"ایک چیز اور۔" دِھیر سل نے آخری چیز بتا کر بُدھ متی کو حیران کر دیا۔

"اور۔۔۔ ایک بوند شہد۔" بُدھ متی نے چونک کر پُوچھا۔ "ایک بوند شہد کا کیا کریں گے آپ؟"

"سوالات کا موقع نہیں۔ اب گھر جاؤ۔ کل اِسی وقت آنا۔"

دِھیر سل نے بیوی کو تاکید کی، خُدا حافظ کہا اور جنگلے کا سہارا لیے اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

مکڑی کے جالے جیسا ریشمی دھاگا تلاش کرنے میں بُدھ متی کو خاصی مُشکل پیش آئی۔ باقی کام آسان تھا۔ ہاں، بھونرے کو ڈھونڈنا اور پکڑنا بھی کُچھ کم مُشکل نہ تھا۔ وزیر کے باغ میں یوں تو بیسیوں قِسم کے بھونرے پھُولوں پر منڈلاتے رہتے تھے، لیکن ننّھے مُنّے اور نازک سے تھے اور بعض کالے موٹے، بھدّے اور سُست۔ بُدھ متی نے ان کو ہاتھ نہ لگایا۔

اچانک اسے ایک پھُول پر ایک نہایت ہی خُوب صُورت بھونرا دِکھائی دیا۔ اس کا سیاہ رنگ دھُوپ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ بُدھ متی جانتی تھی کہ شہد کا شیدائی یہی بھونرا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی وُہ خُوشی سے چیخ اُٹھی": یہی ہے وہ بھونرا جس کی

مُجھے ضرورت ہے۔"

اُس نے آسانی سے بھونرے کو پکڑ لیا۔ پھر ایک پتّے میں لپیٹ کر ریشم کی تھیلی میں سنبھال کر رکھ لیا۔ پھر شہد کی مکھّیوں کے چھتّے سے تازہ شہد نچوڑ کر ایک چھوٹی سی شیشی میں بھرا۔ ریشمی دھاگے کو الگ اور سُوتی دھاگے کو الگ لپیٹا۔ ڈوری اور رسّے کو بھی جُدا جُدا لپیٹ کر رکھ لیا۔ ہر چیز تیّار کر کرا کے وہ رات ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

ان چیزوں کر اکٹھّا کرتے ہوئے بُدھ متی سوچ رہی تھی کہ وہ اس بھونرے کا کیا کریں گے ؟ ایک بُوند شہد اُن کے کِس کام کا؟ کاش وہ کِسی طرح اُس ظالِم مینار سے حفاظت کے ساتھ اُتر آئیں۔ اُسے اُس دِن کا سورج بہت بُرا لگ رہا تھا۔ ہائے ! تیز دھوپ اُن کے سر کو جلا رہی ہو گی۔ خُدا اِس ظالِم راجا سے سمجھے۔ اُس کا سارا دِن انہیں خیالوں میں گُزرا۔

آخر اِنتظار کا بھاری دِن ختم ہوا۔ سُورج مغرب میں ڈوب گیا۔ شام کے سائے پھیلنے لگے۔ ایک ایک کر کے پورا آسمان ستاروں سے بھر گیا۔ بازاروں کی رونق

آہستہ آہستہ ماند پڑ گئی۔ شہر پر خاموشی چھا گئی۔ سُونی اندھیری گلیوں میں گیدڑ چیختے پھرتے تھے۔ ان کی چیخوں کے سوا کوئی اور آواز نہ تھی۔

بُدھ متی نے اپنے آپ کو اچھی طرح چادر میں لپیٹا۔ مُنہ کو گھونگھٹ میں چھُپا لیا۔ بڑی اِحتیاط سے محل کے بڑے دروازے کو پار کیا۔ وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی اور مینار کے پاس جا کر ہی دم لیا۔ اندھیرے میں اُس کی آنکھیں اپنے شوہر کو تلاش کر رہی تھیں۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہا:

"میں آگئی ہوں۔ وہ سب چیزیں لے آئی ہوں جو آپ نے منگائی تھیں۔ ریشمی دھاگا، سُوتی دھاگا، ڈوری، رسّا، بھونرا، اور شہد کی ایک بوند۔"

"پھر تو سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔" وزیر نے خُوش ہو کر کہا۔ "میرا خیال ہے، حالات جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ بُدھ متی، مُجھے یقین تھا کہ تُم مُجھے مایوس نہیں کرو گی۔۔۔ اب ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اگر آج کی رات ختم ہو گئی تو آنے والے دِن کی گرمی مُجھے جان سے مار دے گی۔"

"ہائے! ظالم مینار۔ کاش! میں اِس کو گرا سکتی۔" بُدھ متی نے مینار کو کوستے ہوئے

آہ بھری۔

"ہش۔" دِھیر سل نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ پہرے دار مزے سے سو رہے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے ہماری باتوں سے کِسی کی آنکھ کھُل جائے۔"

"ہائے! خُدا نہ کرے کہ وُہ جاگ اُٹھیں۔ آپ جلدی سے حُکم دیجیے کہ میں کیا کروں؟" بُدھ متی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے پوچھا۔ دِھیر سل دھیمی آواز میں سمجھانے لگا:

"سب سے پہلے تو ریشمی دھاگے کو بھونرے کی کمر میں اچھی طرح باندھ دو۔"

بُدھ متی نے فوراً ریشمی دھاگا نکالا اور گریبان میں چھپائے ہوئے بھونرے کو ڈھونڈا۔ وہ موجود تھا۔ "بھونرا تو ہے، دیکھتی ہوں مُجھ سے دھاگا بندھواتا بھی ہے یا نہیں۔۔۔ لیجیے میں باندھ رہی ہُوں۔"

دِھیر سل نے وہیں کھڑے کھڑے تنبیہ کی: "دیکھنا، اس کی ٹانگیں نہ باندھ دینا۔

اچھّا اگر ریشمی دھاگا اس کی کمر میں بندھ چُکا ہے تو اب اس کی ناک پر شہد کی ایک بُوند ٹپکا دو اور پھِر اِس کو مِینار کی دیوار پر چھوڑ دو۔ یہ دھیان رہے کہ اِس کی ناک اُوپر کی طرف ہونی چاہیے۔ یہ شہد کی خوش بُو سُونگھتا اس مِینار پر اُوپر چڑھتا آئے گا کہ شاید یہاں شہد کا چھتّا ہو۔۔"

"لیجیے، ناک پر شہد لگا کر بھونرا چھوڑ دیا ہے۔"

"کیا وہ دیوار پر چڑھنے لگا ہے؟"

"جی ہاں۔ چڑھ رہا ہے۔"

"ریشمی دھاگے والی گولی ہاتھ میں اچھّی طرح پکڑ رکھی ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"اب دھاگے کو ہولے ہولے ڈھیل دیتی جاؤ۔" دِھیر سل نے کہا۔ "لیکن خیال رکھنا، میری زندگی ریشم کے اِس باریک دھاگے سے بندھی ہوئی ہے۔ اِس کو ٹوٹنے نہ دینا۔" بھونرا شہد کی خُوش بُو کے جادُو میں کھویا ہُوا مِینار کی دیوار پر اُوپر

ہی اُوپر چڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ چھت پر پُہنچ گیا۔ دِھیر سل نے جلدی سے اس کو پکڑ لیا۔ پھر آہستہ سے اُس کی کمر میں بندھے ہوئے ریشمی دھاگے کی گرہ کھولی۔ اس نے دھاگے کا ایک سِرا ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے رکھا اور بھونرے کو اپنی پگڑی کی ملائم تہوں میں حفاظت سے رکھ لیا۔ پھر مینار کے نیچے کھڑی بُدھ متی سے بولا:

"اب سوتی دھاگے کا سِرا اس ریشمہ دھاگے کے سِرے سے باندھ دو۔ کَس کر باندھنا۔ پھر آہستہ آہستہ دھاگا چھوڑتی جانا۔"

بُدھ متی نے اپنے شوہر کی ہدایت پر عمل کیا۔ دونوں سِروں کو اِحتیاط سے باندھا اور سُوتی دھاگے کو ہولے ہولے ڈھیل دینے لگی۔ جلد ہی اُسے اُوپر سے دِھیر سل کی آواز سُنائی دی۔ آواز سے خُوشی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

دِھیر سل نے سارا ریشمی دھاگا ہولے ہولے اُوپر کھینچ لیا تھا۔ اب اُس کے ہاتھ میں سُوتی دھاگے کا سِرا آ چُکا تھا۔ اُس نے ریشمی دھاگے کو اپنی جیب میں رکھ لیا اور سُوتی دھاگے کا سِرا ہاتھ میں تھام کر بُدھ متی سے بولا:

"سمجھو، آدھا کام تو ہو ہی چکا۔ اب یوں کرو کہ ڈوری کا سِرا سُوتی دھاگے کے سرے میں باندھ دو۔ مُجھے یقین ہے، گرہ تو تُم اچھّی طرح لگاؤ گی۔"

"میں سمجھ گی۔ لیجیے۔ گرہ لگ گئی۔" بُدھ متی کا دِل خُوشی سے دھڑک رہا تھا۔

چند لمحے گُزرنے کے بعد دِھیر سل نے اُوپر سے آواز دی۔ "ڈوری کا سرا میرے ہاتھ میں آ چُکا ہے۔ اب رسّے کی باری ہے۔ رسّے کو ڈوری میں کَس کر باندھنا۔ پھر تُمہارا کام ختم۔"

بدھ متی نے رسّا نِکالا، اُس کے سِرے میں ڈوری باندھی اور پھر ڈھیل دینے لگی۔ دِھیر سل جلدی جلدی رسّا کھینچ رہا تھا۔ بُدھ متی کے ہاتھ چھِل گئے اور ان میں سے خُون ٹپکنے لگا۔ خُون میں بھیگا ہُوا رسّا ہولے ہولے دِھیر سل کے پاس جا رہا تھا۔

جُوں ہی رسّے کا سرا دِھیر سل کے ہاتھ میں آیا، اُس کے مُنہ سے مارے خُوشی کے ہلکی سی چیخ نِکل گئی۔ اس نے فوراً رسّے کا سِرا مِینار کے جنگلے سے باندھا اور رسّے کو پکڑ کر کھِسکتا ہُوا نیچے اُتر آیا۔

دونوں چُپ چاپ چلنے لگے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔
جب وہ گھر پہنچے تو سُورج طلُوع ہو رہا تھا۔

سب سے پہلا کام بُدھ متی نے یہ کیا کہ اپنے شوہر کی پگڑی میں سے بھونرا نِکال کر اُسے ٹھیک اُسی جگہ چھوڑ دیا جہاں سے پکڑا تھا تا کہ وہ اپنی باقی زندگی آرام سے بسر کر سکے۔

اِن دو دِنوں میں راجا کو بھی اِحساس ہو گیا تھا کہ اُس نے اپنے عقل مند اور وفادار وزیر کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اب وہ اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا۔ مگر وہ اِتنا مغرور تھا کہ کِسی کے سامنے جھُکنا نہیں جانتا تھا، چاہے وُہ خُود ہی غلطی پر ہو۔

تیسرے دِن راجا نے دربار میں جانے سے اِنکار کر دیا اور حکم دیا کہ کوئی بھی اُس کے پاس نہ آئے۔ وہ محل کی اُوپر والی منزل کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا اور شہر کی فصیل سے باہر بنے ہُوئے مِینار کو تکنے لگا جس میں اُس نے دِھیر سل کو قید کیا تھا۔

اچانک کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ راجا نے جھِڑک کر کہا:

"میں کِسی سے نہیں مِلوں گا۔ جو میرا حکم نہیں مانتا، میں اُس کے کان جڑ سے اُکھڑوا دیتا ہوں۔ سمجھے؟"

"لیکن مہاراج۔" یہ دِھیر سل کی آواز تھی۔ "مہاراج، میرے کان تو سلامت ہی رہنے دیں۔ ان کے بغیر میں آپ کی خدمت کِس طرح کروں گا؟"

راجا نے مُنہ سے خُوشی کے مارے چیخ نِکل گئی۔ وہ لپک کر باہر نِکلا اور وزیر کو گلے لگاتے ہُوئے کہا:

"میں نے تُمہیں اِن تین دِنوں میں بُہت یاد کیا۔ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب میں نے تُمہیں بھُلایا ہو۔" پھر ذرا رُک کر حیرت سے پُوچھا:

"لیکن تُم وہاں سے فرار کیسے ہوئے؟" کِس نے تُمہاری مدد کی؟"

"ایک بھونرے نے، مہاراج۔" دِھیر سل نے جواب دیا اور پھر مُسکراتے ہوئے بولا۔ "بھونرے اور شہد کی ایک بوند نے، مہاراج۔"

دو بہنیں

بُہت زمانہ گُزرا، کشمیر میں دو بہنیں رہتی تھیں۔ اُن کا باپ کشمیر کے راجا کا شکاری تھا۔ وُہ اکثر راجا کے ساتھ شکار پر جاتا، اس لیے دونوں بہنیں گھر میں اکیلی ہی رہتی تھیں۔

دونوں بہنوں کی عُمروں میں تو زیادہ فرق نہ تھا لیکن مزاج میں بے حد فرق تھا۔ بڑی بہن سارا خُود غرض، بد مزاج اور تھڑُ دلی تھی، لیکن چھوٹی بہن تارا اِتنی معصُوم اور من موہنی تھی جیسے کنول کا پھول۔ دُوسروں کے کام آنا اور اُن سے محبّت کرنا ہی اُس کی زندگی تھی۔

تارا کو جو بھی دیکھتا، پسند کرتا۔ لیکن سارا کے بارے میں لوگ اچھّی رائے نہیں رکھتے تھے۔

"چھوڑو جی۔ وہ بد شکل۔ جھاڑ کا کانٹا۔ لڑاکا۔ اُونہہ!"

یہاں تک کہ جنگلی جانور، درخت، ندی نالے بھی اُس سے ناراض تھے۔ لیکن سارا کو اِن باتوں کی کیا پروا۔ وہ تو مزے سے جو جی میں آتا، کرتی۔

سارا ایک روز کچھ زیادہ ہی چڑچڑی ہو رہی تھی۔ اب تارا کو کیا معلوم کہ آپا کا مُوڈ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ وہ اس سے بولی:

"آپا، ہم میں سے کسی کو نانا جان کی خیریت معلُوم کرنے جانا چاہیے۔ کافی دِن گُزر گئے، اُدھر کی خیر خبر نہیں آئی۔ نانا اس برسات میں بیمار ہو گئے تھے۔ ماموں اور مُماناں کھیتوں میں کام کرنے چلی جاتی ہیں تو وہ بے چارے اکیلے پڑے رہتے ہیں۔"

"پڑے رہتے ہیں تو پڑے رہیں، مُجھے کیا۔ اس سے اچھے بھی کئی کام کرنے کو ہیں۔ خواہ مخواہ جنگل میں مارے مارے پھرو۔ کوئی پُوچھے بھئی، کہاں جا رہے ہو؟ جی بُڈّھے کی خیریت پُوچھنے۔۔۔ ہاہاہا! تُمھیں شوق ہے تو جاؤ۔ میں تو نہیں جاؤں گی۔ پر وہاں سارا دِن نہ گنوا آنا۔ تُمھیں واپس آ کر میری قمیص کی مرمّت بھی کرنا ہے اور دھان بھی چھُڑانے ہیں۔ بس آج رات تک کے لیے تھوڑے سے

چاول ہیں۔ اور ہوں گے تو کل پکیں گے۔ اور دیکھو، راستے میں دیر نہ کر دینا۔ ورنہ پھر کبھی نہیں جانے دوں گی۔۔۔ سمجھیں؟"

"جی۔ سمجھی، آپا۔ "

تارا اکیلی ہی نانا کے گھر چل پڑی۔ ابھی زیادہ دُور نہ گئی تھی کہ اچانک ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی اُسے رُکنے کے لیے کہہ رہا ہو۔ وہ اُس وقت آلُوچے کی ٹہنیوں کے نیچے سے گُزر رہی تھی جو آندھی اور بارش کی وجہ سے بل کھا کر جھک گئی تھیں۔

"پیاری تارا!" آواز آئی۔ "رُک جاؤ، اور میری مدد کرو۔ میری حالت بہت خراب ہے۔"

تارا نے آلُوچے کی ٹہنیوں کو غور سے دیکھا اور سوچا۔ "میرا خیال ہے، یہ آلُوچے کی ٹہنیاں ہی بول رہی ہیں۔ اور تو یہاں کوئی نہیں۔"

تارا کو ذرّہ برابر حیرت نہ ہوئی کیوں کہ اس قسم کی باتیں اُس کی زندگی میں روز

ہوتی رہتی تھیں۔ ”ہاں ہاں۔ یہ آلُوچہ ہی بول رہا ہے۔“ اُس نے دِل میں سوچا۔

پھر آواز آئی۔ ”میری ٹہنیاں ہوا کے تیز جھونکوں سے ایک دوسری میں پھنس گئی ہیں۔ جب پھُول کھِلنے کے دِن آئیں گے تو اُن کو سُورج کی کِرنیں نصیب نہیں ہوں گی، اور پھُول پھل نہیں بن سکیں گے۔ ان ٹہنیوں کو سیدھا کر دو، تارا رانی۔“

”کیوں نہیں“ تارا نے یہ کہہ کر اپنی چھوٹی سی گٹھڑی زمین پر رکھی اور بڑے شوق سے ٹہنیوں کو ٹھیک کر دیا۔ کانٹے چُبھنے سے اُس کے ہاتھوں سے خُون رسنے لگا، لیکن اُس نے پروانہ کی۔ اب ان ٹہنیوں پر دھُوپ بھی پڑ سکتی تھی اور ان میں سے ہوا بھی گزر سکتی تھی۔

”کتنا اچھا لگ رہا ہے اب۔“ آلُوچے کے درخت نے سُریلی آواز میں کہا۔ ”ننّھی تارا، میں تُمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ آیندہ جب تُم یہاں سے گُزرو گی تو میں بدلہ چُکا دُوں گا۔“

تارا نے جواب دیا۔ ”مجھے تُمہاری مدد کر کے بے حد خُوشی ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر

وہ چلنے لگی۔

اُسے کُچھ دیر ہو گئی تھی، اِس لیے چلنے کی بجائے دوڑنے لگی۔ دوڑتے دوڑتے راستے میں ایک جگہ آگ کا الاؤ آیا جو اب بُجھ چُکا تھا۔ یہ آگ شاید کِسی لکڑہارے نے جلائی ہو گی اور پھر اُسے یُوں ہی چھوڑ کر چلا گیا ہو گا۔ آگ نے تارا کو پُکار کر کہا۔ "تارا، تارا! اتنی جلدی مت کرو۔ دیکھو، میں اپنی ہی راکھ تلے دم توڑ رہی ہُوں۔"

تارا رُک گئی اور بولی۔ "وہ تو ہے۔ لیکن میں اس چھڑی کی نُوک سے تُمہیں کُرید دیتی ہُوں۔ تُم دھکنے لگو گی۔"

اِتنا کہہ کر تارا نے چھڑی سے راکھ ہٹا دی۔ کوئلوں کو جُوں ہی ہوا لگی، وہ دہک اُٹھے۔ پھر شُعلے بھڑکنے لگے، جیسے تالیاں بجا کر ناچ رہے ہُوں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہُوں:

"پیاری تارا، ہم تُمہیں یاد رکھیں گے۔"

تارانے اپنا سفر پھر شروع کر دیا۔ تھوڑی دُور گئی تھی کہ اس کا راستہ پیپل کی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ نے رُوک لیا۔ رات کی آندھی نے اِ ُسے توڑ کر زمین پر ِگرا دیا تھا۔

"تارا! پیاری تارا!" درخت چلّایا۔ "ذرا رُک جاؤ۔ دیکھو، آندھی نے میرے ساتھ کیا ظُلم کیا۔ میں اس شاخ کی جُدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ تُم اسے اُٹھا کر پھر میری گود میں رکھ دو، ورنہ یہ سُوکھ کر مر جائے گی۔" رحم دل تارانے کہا۔ "چچ۔ چچ۔ کِتنی بُری بات ہو گی۔ میں ابھی شاخ کو باندھ دیتی ہُوں۔"

لیکن تارا کو خیال آیا کہ وہ شاخ کو باندھے گی کِس سے؟ اس وقت وہ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہُوئے تھی، کیوں کہ نانا سے ملنے جا رہی تھی۔ سب سے خُوب صُورت تو اُس کی چُنری تھی۔ پیاز کے چھلکے جیسی باریک گُلابی چُنری پر ستارے لگے ہوئے تھے۔ یہ چُنری اُس کے نانا کو بھی بے حد پسند تھی۔ لیکن اِس وقت اُس کے سامنے زخمی شاخ پڑی تھی، جس کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس کے نرم پتّے پہلے ہی دم تُوڑ چُکے تھے۔ تارا دِل میں دُکھ لیے اس کو تک رہی تھی

کہ اُس کے بازُو پر دو قطرے گِرے۔ شاید پیپل رُو رہا تھا۔

اب کیا تھا۔ تارا نے بغیر کُچھ سوچے چُنری پھاڑی اور شاخ کو پیپل کے ساتھ باندھ دیا۔ پیپل نے اِطمینان کا سانس لیا۔

"رحم دِل تارا، پیاری لڑکی۔" یوں لگتا تھا جیسے پیپل کہہ رہا ہو۔ "اچھّی لڑکی، میں بھی ایک دِن تُمہارے کام آؤں گا۔" اب تارا کو بُہت دیر ہو چُکی تھی۔ وہ پھٹی ہوئی چُنری اُوڑھے، دوڑ رہی تھی۔ راستے میں ایک چھوٹا سا چشمہ پڑتا تھا۔ تارا اُسے پھلانگنے لگی تو ایک آواز آئی۔ تارا وہیں کی وہیں رُک گئی اور غور سے سُننے لگی۔ چشمہ کہہ رہا تھا:

"مُجھ سے زیادہ بدنصیب کوئی چشمہ نہ ہو گا۔ رات کی بارش اور آندھی نے مُجھے ریت اور پتّوں سے پاٹ دیا ہے۔ میں اب کبھی دریا سے ملنے نہیں جا سکتا۔ دریا مُجھے سمُندر تک لے جاتا۔ اور میں سمجھتا کہ میری زندگی مکمّل ہو گئی۔ اب تو میں بہہ نہیں سکتا۔ میں مر رہا ہُوں۔"

"ہاں۔۔۔ سچ مُچ۔۔۔" تارا کے مُنہ سے آہ نِکل گئی۔ پھر اُس نے چشمے پر جھُک کر

دونوں ہاتھوں کا چُلّو سا بنایا اور ریت اور پتّے نِکال کر چشمے کو صاف کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی میں بہاؤ پیدا ہو گیا اب چشمہ بڑے بانکپن سے گُنگناتا ننّھی مُنّی لہروں کا جال بُنتا، بہہ رہا تھا اور بہُت خُوش تھا۔

چشمے نے بھی تارا سے وہی بات کہی جو اوروں نے کہی تھی۔ "تارا رانی، میں تُمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

تارا نانا کی جھونپڑی کے پاس پُہنچی تو اُس کی سانس پھُول رہی تھی۔

بڑے میاں تارا کو دیکھ کر بہت خوش ہُوئے۔ مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تارا تو ہمیشہ صاف سُتھری رہتی ہے، اور آج پھٹا ہُوا دوپٹا اوڑھ رکھا ہے، بال اُلجھے ہوئے ہیں اور اُن میں گرد و غُبار، تنکے پتّے اٹکے ہُوئے ہیں۔

"میری بیٹی کِس راستے سے آئی ہے جو یہ حلیہ بن گیا ہے۔" بڑے میاں نے سوال کیا۔

"جو سب سے چھوٹا تھا، نانا جان۔ لیکن راستے میں کئی کام کرنے پڑے۔" تارا نے

جواب دیا۔

"چلو، خیر تُم جس طرح اور جیسے بھی آئی ہو، میرے لیے نُور بن کر آئی ہو۔"
بڑے میاں نے پیار سے تارا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اسے جھونپڑے میں لے جا کر دُودھ میں خطائیاں ڈال کر کھلائیں جو اُنہوں نے اپنے ناشتے میں سے بچا کر رکھی تھیں۔

بڑے میاں کے بیٹے اور بہوئیں اُن کے ساتھ اچھّا سلُوک نہ کرتی تھیں۔ پہلے میاں بُوڑھے تھے۔ اس لیے بُری بھلی جیسی گُزر رہی تھی، اپنے بیٹوں کے پاس رہ کر گُزار رہے تھے۔ اُنہیں تارا کے ساتھ سب سے زیادہ پیار تھا۔ تارا آجاتی تو اُن میں ایک نئی زِندگی دوڑ جاتی۔ وہ جب گھر واپس جانے لگتی تو نانا جان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ تاکید کرتے کہ "بیٹی، جلدی جلدی آیا کرو۔"

آج بھی نانا جان نے سارا کا حال پُوچھا اور یہ بھی پُوچھا کہ اُس کا مزاج پہلے سے بہتر ہوا ہے نہیں؟ جب تارا نے اُن کو بتایا کہ اگلی بار سارا آپ سے ملنے آئے گی تو وہ خوش نہیں ہُوئے اور بولے:

"اس سے کہنا، تکلیف نہ کرے۔"

یہ کہہ کر بڑے میاں نے سونے کا خُوب صُورت جڑاؤ بازو بند نِکالا اور تارا کو دیتے ہُوئے کہا۔ "تارا، میری بچّی۔ یہ لو۔ یہ میں نے تُمہارے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔"

تارا تحفہ دیکھ کر خُوشی سے اُچھل پڑی، لیکن پھر کُچھ سوچ کر ہاتھ کھینچ لیا۔

"نہ نانا جان۔ مُمانیاں آپ سے ناراض ہوں گی۔ اگر میں نے بازُو بند لے لیا تو وہ ضُرور آپ سے پُوچھیں گی اور پھر جل بھُن جائیں گی۔"

"جلتی ہیں تو جلا کریں۔ کوئی پروا نہیں۔" بڑے میاں کو غصّہ آ گیا اور اُنہوں نے چیخ کر کہا۔ "یہ عورتیں، یہ عورتیں مُجھ سے اچھّا سلُوک نہیں کرتیں۔ میں اُن کو کوئی چیز نہیں دُوں گا۔"

بڑے میاں نے بازو بند تارا کے نازُک سے بازُو ہیں پہنا دیا۔ وہ تارا کے گورے بازُو میں بہت بھلا لگ رہا تھا۔ بہت ہی جچ رہا تھا۔

"بیٹی، میرے پاس تُمہاری نانی کے بُندے بھی ہیں، ٹیکا بھی ہے۔" نانا جی خوشی سے چہک رہے تھے۔ "اگر تُمہاری مُمانیوں کو پتا چل جائے نا کہ میں نے وہ کہاں چھُپا رکھے ہیں تو وہ چُرا کر ٹھکانے لگا دیں۔ پھر میں تُمہیں کیا دُوں گا؟"

تارا کبھی بازو بند کو دیکھتی تھی اور کبھی اپنے پیارے نانا کو۔ اُس کی خُوشی کی اِنتہا نہ تھی۔

"نانا جان، آپ مُجھے دُنیا میں سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ سب سے زیادہ۔" یہ کہہ کر اُس نے نانا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پیار کیا۔ "اور میں بھی تُمہیں سے پیار کرتا ہوں، بیٹی۔ صرف تُم سے۔" نانا نے بھی تارا کا مُنہ چُوما اور کہا۔ "بیٹی، اب تم گھر بھاگ جاؤ۔ چاند نِکل آیا ہے۔ رات ہُوئی سمجھو۔ میں نہیں چاہتا تُمہیں راستے میں کوئی چیتا ویتا پکڑ لے۔ جاؤ، تیز بھاگو۔"

اور تارا تیز تیز بھاگی جب گھر پُہنچی تو سارا غصّے سے آگ بگولا ہوئی بیٹھی تھی۔

"تم نے جاتے ہوئے یہ تو نہیں بتایا کہ سارا دِن گزار کر آؤ گی۔ کم بخت۔" سارا تارا کر دیکھتے ہی چلّائی۔ "سارا کام مُجھے کرنا پڑا۔ گھر میں کون تھا جس سے میں بات

کرتی۔ بند کیے کیے مُنہ اکڑ گیا۔"

اچانک سارا کی نظر تارا کے بازُو پر پڑی۔ وہ چیخ اُٹھی۔ "یہ چمک دار چیز کیا پہن رکھی ہے؟ کہاں سے لی؟ "

اس نے جھپٹ کر تارا کے بازو سے بازُو بند اُتارنا چاہا۔ تارا نے بازُو بند چھُپاتے ہوئے کہا:

"نانا ابّا نے مُجھے دیا ہے۔ یُوں نہ کھینچو۔ آپ نے تو میرا بازو چھیل دیا۔"

"نانا ابّا نے میرے لیے کیا بھیجا ہے؟" سارا کی آنکھیں غصّے سے انگارا ہو رہی تھیں۔

"بس مُجھے ہی دیا ہے۔ آپ کے لیے کُچھ نہیں بھیجا۔" تارا نے بازُو بند کو دوسرے ہاتھ سے چھُپاتے ہُوئے جواب دیا۔

"ہاں ہاں! تبھی تو اتنے چاؤ سے نانا کے پاس جاتی ہو۔" سارا نے حقارت سے کہا۔

"اچھّا۔ ٹھیک ہے۔ کل میں نانا کے گھر جاؤں گی۔ اور اگر نانا نے مُجھے کُچھ نہ دیا تو

میں تُمہارا بازُو بند چھین لُوں گی۔ سمجھیں؟"

سارے غصّے سے گھر میں پھنکارتی پھِری۔ اِسی حالت میں سو گئی، اور اگلے دِن سُورج نکلنے سے پہلے ہی نانا کے گھر روانہ ہو گئی۔ جوں ہی وہ آلُوچے کے درخت کے پاس پہنچی، آواز آئی:

"سارا! کتنی اچھّی لڑکی ہو تُم ذرا تک جاؤ، اور میری ٹہنیوں کو سیدھا کر دو۔ دیکھو، کیسے اُلجھ رہی ہیں۔"

سارا نے سر جھٹک کر کہا۔ "اُونہہ! تُمہاری ٹہنیاں سُلجھانے سے بہتر کئی اور کام کرنے ہیں مُجھے۔"

یہی جواب اُس نے پیپل کو دیا۔ آگ کو بھی وُہ ٹکا سا جواب دے کر آگے بڑھ گئی۔ چشمے کے ساتھ تو وُہ بُہت بد تمیزی سے پیش آئی۔ وُہ بے چارہ رات کی بارش کی وجہ سے ریت اور پتّوں سے اٹا پڑا تھا۔ سارا کا جواب سُن کر بڑبڑانے لگا۔ لیکن تارا نے پروانہ کی۔

سارا نانا جان کے جھونپڑے میں پہنچی تو دیکھا کہ بڑے میاں سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں۔ اُن کے پاس کسی نے نہ تو آگ کی انگیٹھی رکھی تھی اور نہ انہیں کھانا کھلایا تھا۔ سارا نے ان باتوں کی طرف بالکل دھان نہ دیا۔ نانا جان کو بھی اس سے مل کر خوشی نہیں ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑے میاں نے سارا کو دیکھ کر جلدی جلدی اپنی ہر چیز چھُپادی تھی تاکہ وہ جھپٹ نہ لے۔

اب سارا تھی بڑی بے صبر۔ اُس نے نانا کا حال پُوچھا نہ احوال، آتے ہی تحفے کا تقاضا کرنے لگی:

"آپ نے تارا کو سونے کا بازُو بند دیا۔ میں اُس سے بڑی ہُوں۔ وُہ مُجھے ملنا چاہیے تھا۔" بڑے میاں بھی کچھ کم نہ تھے۔ وہ بولے۔ "تارا پہلے مُجھ سے ملنے آئی تھی۔ اب مُجھے کیا معلُوم کہ اگلے روز تُم بھی چلی آؤ گی۔"

سارا غصّے سے رو رہی تھی۔ چِلّا رہی تھی۔ آن کی آن میں اُس نے نانا کی جھونپڑی کا سارا سامان الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ وہ کونوں کھُدروں میں ہاتھ ڈال کر زیور تلاش کر رہی تھی۔ اور تو کُچھ نہ ملا، البتّہ ایک بچھّو پر ہاتھ جا پڑا۔

"ہائے! ہائے! ہائے! میں مری!" بچھّو نے ڈنک مار دیا تو وہ دہاڑنے لگی۔ بچھّو کے کاٹے کا درد بُہت ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ پکڑے تڑپتی، ہائے وائے کرتی، باہر دوڑی۔ نانا کو سلام کیا نہ خُدا حافظ کہا، بس اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگی۔ نانا جان کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ جتنی ہنسی انہیں اس وقت آ رہی تھی، شاید زندگی بھر نہ آئی ہو گی۔

جب سارا نظروں سے اوجھل ہو گئی تو بڑے میاں نے چھُپا کر رکھا ہوا کھانا نِکالا اور مزے مزے سے کھانے لگے۔ سارا گھر پہنچتے ہی تارا پر برس پڑی۔ "یہ سب تُمہاری وجہ سے ہوا۔ مکّار کہیں کی۔ نانا نے بازُو بند میرے لیے ہی رکھا تھا، کیوں کہ میں بڑی ہُوں۔"

"کیا نانا ابّا بھی یہی کہتے تھے؟" تارا نے حیرت سے پُوچھا۔ پھر بولی۔ "ہاں آپا۔ آپ مُجھ سے سچ مُچ بڑی ہیں۔ لیجیے، آپ ہی لے لیں۔ بازُو بند آپ کے بازُو میں ہو یا میرے بازُو میں، ایک ہی بات ہے۔ میں آپ کو پہنا ہوا دیکھ کر خُوش ہو لیا کروں گی۔" یہ کہہ کر اُس نے سارا کو بازُو بند دے دیا۔

اس بات کو کئی ہفتے گُزر گئے۔ ایک روز خبر آئی کہ نانا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ تارا نے بڑی بہن سے کہا:

"ہم میں سے ایک کو نانا جان کی خبر لینے ضُرور جانا چاہیے۔ شاید ہم اُن کے کسی کام آسکیں۔ "

سارا نے کندھے جھٹک کر کہا۔ "تم جاؤ، نانا کی لاڈلی۔ تُمہیں کو وہ بازُو بند دیتے ہیں۔ بہت دیکھ لیا نانا کو۔ پچھلی بار گئی تھی نا۔ اُونھ اُلٹا بچھّو نے کاٹ لیا۔ میں بھُولی تو نہیں، اور نہ بھُولوں گی۔"

اب تارا ہی کو جانا تھا۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر چل پڑی۔ اس بار آلُوچے کے درخت نے اُسے روکا نہیں بلکہ دُعا دی۔ پیپل نے بھی دُعا دی۔ آگ اور چشمے نے بھی سفر بخیر کہا۔ "تارا رُکے بغیر چلتی گئی۔ آلُوچے کے درخت، پیپل، چشمے اور آگ نے تارا کو بھُلایا نہ تھا۔ وہ اُس کے لیے دُعائیں مانگ رہے تھے۔

جب وُہ نانا کی جھونپڑی میں پہنچی تو دیکھا کہ نانا ابّا تو بھلے چنگے ہیں۔

جب نانا اور نواسی دُودھ خطائیاں کھا پی چُکے تو بڑے میاں اُٹھے اور جھونپڑی کی دیوار کے پاس جا کر کُچھ کھودنے لگے۔ تارا حیران رہ گئی۔ جب نان ابّا نے ایک بڑا سا پتھّر اُٹھا کر الگ رکھ دیا۔ پتھّر کے پیچھے ایک بہت بڑا سوراخ تھا، اِتنا بڑا کہ اُس میں پُورا آدمی سما جائے۔

نانا ابّا نے سوراخ میں سے ایک چرخا نِکالا اور تارا سے کہا۔ "اس کے متعلّق میرے سِوا کوئی نہیں جانتا۔" پھر انہوں نے تانبے اور پیتل کے کُچھ برتن نِکالے جن کو وہ لوٹے کہتے تھے۔ یہ لوٹے نہایت خُوب صُورت تھے اور اُن پر خُوش نُما پھُول بنے ہوئے تھے۔ یہ بڑے میاں کی عُمر بھر کی کمائی تھی اور اُن کی بیوی کی نشانیاں تھیں۔ بڑے میاں کی بیوی جوانی میں مر گئی تھی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر بڑے میاں کُچھ اُداس ہو گئے۔ پھر جھُکی ہوئی کمر کو سیدھا کرتے ہوئے بولے:

"تارا، میری بچّی۔ تُم ہو بہو اپنی نانی پر گئی ہو۔ ویسا ہی درد بھرا دل، میٹھے بول، خُوب صُورت چہرہ۔ اُس کی بھنویں بالکل تُمہاری جیسی تھیں۔ بڑی بڑی جھیل سی آنکھوں پر آدھے چاند جھُکے ہُوئے۔ ہاں بیٹی، تُم بالکل اُنہی جیسی ہو۔ یہ چیزیں

میں نے تُمہاری نانی کو دی تھیں۔ اب تُم لے جاؤ۔ اَیسا نہ ہو کہ میری لڑاکا بہوئیں آجائیں، اور سب راز کھُل جائے۔ اب جاؤ۔ خُدا حافظ۔"

تارا کے مُنہ سے تو الفاظ نہیں نکلتے تھے۔ پھر بھی اُس نے نانا کو خُوش کرنے کی خاطر کہا۔ "نانا ابّا، آپ نے تو مُجھے اتنی چیزیں دے دی ہیں کہ میں اُٹھا کر لے جا بھی نہ سکوں گی۔"

"ہاں بیٹی، تُمہارے لیے اُٹھانا مُشکل ہے۔" نانا ابّا نے جلدی سے کہا۔ "یُوں کرو کہ میری بھینس بھی لیتی جاؤ۔ یہ چیزیں اس پر لاد دینا۔ یہ تُمہیں اور تُمہاری ساری چیزوں کو حفاظت سے لے جائے گی اور یہ ویسے بھی تُمہارے بہت کام آئے گی۔ اِس کا دودھ اتنا اچھّا ہے کہ کِسی کا نہ ہو گا، اور مکھّن کی تو بات نہ پُوچھو۔"

"نانا جان، بھینس میں لے گئی تو آپ دُودھ کہاں سے پئیں گے؟ آپ کو بھی تو ضُرورت ہو گی۔"

"بیٹی، تُمہاری خُوشی میں میری خوشی ہے۔ میری فکر نہ کرو۔" نانا نے تارا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا۔

تارالدی پھندی گھر واپس چلی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی دلہن اپنے دولہا کے ساتھ سُسرال جارہی ہو۔

بھینس چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی چل رہی تھی۔ اگر چشمہ تارا کو آواز نہ دیتا تو بھینس کبھی نہ رُکتی۔ چشمے نے خُوش ہو کر کہا: "پیاری تارارانی، مُبارک ہو۔ میں بھی تُمہیں تُحفہ دینا چاہتی ہوں۔ بس میں یہی سوچ رہا تھا کہ تُم اُٹھاؤ گی کیوں کر؟ لیکن میں نے دیکھ لیا کہ تُمہارے پاس بھینس ہے۔ آسانی سے لے جاسکو گی۔"

تارا نے چشمے کی طرف دیکھا۔ چشمے کے پار چاندی کے تاروں کا بنا ہوا کپڑا پڑا تھا۔

"لے لو، تارا۔ اپنی شادی کے لیے ساڑھی بنا لینا۔" چشمے نے کہا۔ "میں یہ کپڑا پہاڑوں سے اکٹھا کر کے لایا ہوں۔ وہاں پریاں اِس کپڑے کو تیّار کرتی ہیں۔"

تارا کو شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مِل رہے تھے۔ اس نے چاندی کے تاروں والا کپڑا لپیٹا اور باقی چیزوں کے ساتھ سنبھال کر رکھ لیا۔ بھینس پھر چلنے لگی۔

جُوں ہی تارا پیپل کے درخت کے قریب پہنچی کہیں سے باریک سی آواز سُنائی دی۔ تارا نے فوراً نظریں اُٹھا کر اُوپر دیکھا۔ وہاں اُسی شاخ پر جس کو تارا نے اپنی چُنری پھاڑ کر باندھا تھا، چُنری کے چیتھڑے کی جگہ موٹے موٹے سچّے موتیوں کا ہار لٹک رہا تھا۔

"یہ تُمہارے لیے ہے، تارا۔" پیپل نے کہا۔ "میں نے یہ ہار ایک شہزادے کی پگڑی سے اُتار لیا تھا، جب وہ میرے سائے تلے آ کر ٹھہرا تھا۔ تارا، میرا ناچیز تُحفہ قبول کر لو۔"

تارا نے موتیوں کا ہار اپنے گلے میں پہن لیا اور خُوشی خُوشی روانہ ہو گئی۔

"اتنی تیز مت چلو، تارا بیٹی۔ اتنا تیز چلنا ٹھیک نہیں۔" آگ نے کہا۔ "لگتا ہے تُمہیں سخت بھُوک لگی ہے۔ دیکھو، میں نے تُمہارے لیے میٹھی روٹی تیّار کی ہے۔"

تارا نے شکریہ کہہ کر میٹھی روٹی لے کر اُس کے دو حصّے کیے۔ ایک حصّہ بڑی بہن کے لیے رکھ لیا اور دوسرا ٹکڑا چلتے چلتے کھاتی گئی۔

جب وہ آلُوچے کے درخت کے قریب پُہنچی تو اس کی ٹہنیاں پکے ہُوئے زرد رنگ کے آلُوچوں سے بھری ہوئی تھیں۔

"لے لو۔ جتنے دل چاہے، لے لو۔ یہ تُمہارا اِنعام ہے۔ تم ہی نے تو میری اُلجھی ہوئی ٹہنیاں سنواریں ہیں۔"

تارا نے آلُوچوں سے اپنی جھولی بھر لی۔ کُچھ خُود کھائے اور کچھ اپنی آپا سارا کے لیے رکھ لیے۔

جب تارا اپنے گھر پہنچی تو سارا کے غصّے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اتنی ساری چیزیں لے کر بھی وُہ خُوش نہیں تھی۔ تارا کو دیکھتے ہی لال پیلی ہو کر بولی:

"آ گئیں آخر۔"

"آپا پیاری آپا۔ آج اگر تم ابّا کے پاس جاتیں تو وہ تُمہیں بُہت کُچھ دیتے، جیسے مُجھے دیا ہے۔"

"ضُرور۔ میں ضُرور نانا ابّا کے پاس جاؤں گی۔" سارا نے جواب دیا۔ "اور تم سے

کہیں زیادہ چیزیں لے کر آؤں گی۔ اور پھر تُمہیں جلاؤں گی۔"

سارا نے ساری رات کانٹوں پر کاٹی اور اگلے دِن صُبح سویرے نانا کے گھر کی طرف چل پڑی۔

"ہی ہی۔۔۔" جب سارا آلوچے کے درخت کے نیچے سے گُزر رہی تھی تو درخت نے اُس کا مذاق اُڑایا۔

"چِخ۔" آگ کے پاس سے گُزری تو آگ ہنسی۔ وہ بھی اُس کی ہنسی اُڑا رہی تھی۔

سارا ان چیزوں کی طرف کیا دھیان دیتی۔ چشمہ، پیپل، آگ، آلُوچے جو بھی کہیں، کہتے رہیں۔ سارا کی بلا سے۔ اس کو ایک ہی دُھن تھی کہ کِسی طرح جلدی سے نانا کے گھر پُہنچ جائے۔

نانا ابّا پہلے کی طرح، بغیر آگ کے، سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ سارا جاتے ہی چیخی:

"میں اپنا حصّہ لینے آئی ہُوں۔"

"کیسا حصّہ، بیٹی؟" بڑے میاں نے داڑھی کھُجاتے ہُوئے پُوچھا۔

"زیادہ نہ سہی، اِتنی چیزیں تو ضُرور لوں گی جتنی آپ نے تارا کو دی ہیں۔ لیے بغیر نہیں ٹلوں گی۔ ہر گز نہیں جاؤں گی۔" سارا نانا ابّا کے پیچھے پڑ گئی۔

"یا تو تُم خواب دیکھ رہی ہو یا میں دیکھ رہا ہُوں۔ بولو، مُجھ جیسے بُڈّھے کے پاس اِتنا مال کہاں سے آیا جو لوگوں میں بانٹا پھروں۔ میرے لیے تو اِتنا ہی بُہت ہے کہ میری بد مزاج بہوئیں مُجھے کھانا دے دیتی ہیں اور میں پیٹ بھر لیتا ہُوں۔"

بڑے میاں ابھی بول ہی رہے تھے کہ بہوئیں اور بیٹے بھی آ گئے۔

"لو بھئی، اپنے آپ ہی ہاتھ آ گئی۔" ایک ماموں گرج کر سارا کی طرف لپکا۔

دُوسرے نے سارا کو جھنجھوڑتے ہوئے پُوچھا۔ "ابّا کی بھینس بھی ہانک کر لے گئی، اور نہ جانے کیا کیا اُس پر لاد کر لے گئی۔ کم بخت چوٹی۔"

بڑی مُمانی پنجے جھاڑ کر سارا کے پیچھے پڑ گئی اور دو تین طمانچے جڑ دیے۔

"لُٹیرن کہیں کی۔" دوسری مُمانی گھُونسے اور دو ہتّڑ برساتے ہُوئے بولی۔

"اسی چھوکری نے تُمہیں کل لُوٹا تھانا، ابّا جان؟" سب ایک زبان ہو کر بڑے میاں سے پُوچھ رہے تھے اور بڑے میاں گھبراہٹ میں "ہاں ہاں" کہے جا رہے تھے۔

"مگر ابّا جان، اِسے آپ کی چیزوں کا پتا کیسے چلا کہ کہاں چھُپا رکھی ہیں آپ نے؟" بڑے بیٹے نے سارا کی طرف گھورتے ہوئے پُوچھا، اور سارا خُوف کے مارے پرے کھسکنے لگی۔

بڑے میاں نے سر ہلاتے ہُوئے کہا۔ "میرا خیال ہے، میری آنکھ لگ گئی تھی۔ بھُوک کی وجہ سے اکثر اُونگھ جاتا ہُوں۔"

"اب پھر لُوٹنے کے لیے آئی ہے۔ اب کیا لے گی، اللہ ماری؟ سب تو چُرا کر لے گئی۔ ہائے۔ تُجھے خُدا سمجھے۔" مُمانیاں چیختی چلّاتی اُسے پیٹنے کو دوڑیں۔

اُنہوں نے ڈری سہمی سارا کو پکڑ لیا، دھکّے دے کر جھونپڑی سے باہر نِکالا اور پھر چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی جنگل میں چھوڑ آئیں۔ سارا روتی دہاڑتی جان چھُڑا کر بھاگی۔ اُنہوں نے سارا کے پتّھر اور آلو بخارے مارنے شروع کر دیے۔

سارا کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ جسم پر جگہ جگہ خراشیں لگی تھیں۔ جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے۔ بال بکھرے ہوئے۔ سانس پھُولی ہُوئی۔ وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ جان تو بچ گئی مگر اب اُسے سخت بھُوک لگ رہی تھی۔ صُبح سے ایک کھیل تک اُس کے مُنہ میں اُڑ کر نہیں گئی تھی۔ وہ روتی جاتی اور کہتی جاتی:

"کوئی بات نہیں۔ آگ مجھے میٹھی روٹی ضُرور دے گی۔ پیپل کا درخت سچّے موتیوں کا ہار دے گا۔ آلُوچے کا درخت میٹھے میٹھے آلُوچے دے گا اور چشمہ چاندی کا نہیں سونے کے تاروں کا کپڑا دے گا۔ تارا کا تو چاندی کے تاروں کا بنا ہُوا تھا۔ اُنہہ"!

سارا ہر ایک کے پاس رُکی۔ لیکن کِسی نے جھُوٹے مُنہ بھی نہ پُوچھا۔ جب وہ چشمے کے پاس پہنچی تو وہاں چاندی کے بجائے بے شک سونے کے تاروں والا سُنہری کپڑا پھیلا ہُوا تھا۔ سارا جُوں ہی کپڑا لینے کے لئے آگے کو جھُکی، اُس کا پاؤں رپٹ گیا اور وُہ گہرے پانی میں گِر گئی۔

اور چشمہ جو بُرے بھلے کو خُوب جانتا تھا، سارا کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ وہ بہتا

گیا، بہتا گیا، یہاں تک کہ دریا تک پہنچ گیا۔ دریا مال سے لدے ہوئے جہازوں اور کشتیوں کے ساتھ سارا کو بھی بہا لے گیا اور جا کر سمُندر میں ڈال دیا۔ اُس نے سمُندر سے کہا:

"اے بزرگ سمُندر، یہ نذرانہ اس چشمے کی طرف سے ہے جو کشمیر کی پہاڑیوں میں بہتا ہے۔ اِسے قبول کر۔"

کچھوا اور ہنسوں کا جوڑا

کسی تالاب کے کنارے ہنسوں کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ یہ ہنس پالتو نہیں تھے، لیکن بڑے سادہ دل اور دوستوں کے دوست تھے۔ اپنے ہمسایوں کے ساتھ صُلح صفائی اور محبّت سے رہتے اور ہمیشہ دوسروں کا کام کر کے خوش ہوتے۔

اِسی تالاب کے کنارے پہلے پتھّر کے نیچے ایک کچھوا رہتا تھا۔ یہ کچھوا بڑا لڑاکا اور جلے تن تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جلنا کُڑھنا اُس کی عادت تھی۔ پھر بھی راج ہنس اس کو اچھّا ہی سمجھتے تھے۔

ایک سال جب گرمی کا موسم آیا اور دھُوپ ذرا جم کے پڑنے لگی تو تالاب کا پانی سُوکھنے لگا۔ تالاب میں تیرتے کنول کے پھُول بھی مُرجھا گئے اور مچھلیاں پانی کی کمی کی وجہ سے ایک ایک کر کے مرنے لگیں۔

یہ دیکھ کر راج ہنس نے اپنی مادہ سے کہا: ”اب ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔“

مادہ نے جواب دیا۔ ”کُچھ دِنوں سے میں بھی فِکر مند ہوں۔ پانی تو اِس تیزی کے ساتھ غائب ہو رہا ہے کہ خُدا کی پناہ۔ ہمیں جلد ہی کِسی دُوسری جگہ چلے جانا چاہیے۔“

راج ہنس نے کہا۔ ”لیکن جب تک ہم اپنے دوست کچھوے سے نہ پُوچھ لیں، ہمیں کُچھ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بُوڑھا ہے۔ زندگی کا کافی تجربہ رکھتا ہے۔ ضُرور نیک مشورہ دے گا۔“

دونوں کچھوے کے پاس گئے۔ کچھوا ایک پتھّر کے نیچے آرام سے سو رہا تھا۔ راج ہنسوں نے اُسے جگایا تو اُس کا مزاج ہی بگڑ گیا۔ اُس نے غُصّے سے کہا:

”یہ وقت ہے ملاقات کا؟ عین دوپہر کو ملنے چلے آرہے ہیں۔ واہ! جھُلسا دینے والی گرمی پڑ رہی ہے۔ توبہ!۔۔۔ ہاں، اگر آپ کو کُچھ کہنا ہے تو اِس وقت تشریف لے جایئے اور شام کو آیئے۔ میری ابھی ابھی آنکھ لگی تھی۔ آپ لوگ بھی جا کر سو جائیں۔“ راج ہنس سوچتے ہُوئے بولا۔ ”میرے پیارے دوست۔ ہمیں تو فکر لگی ہُوئی ہے۔ بھلا نیند کہاں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ تالاب سُوکھ رہا ہے اور کتنی

ہی مچھلیاں مر چکی ہیں۔ جلد ہی ایک دِن ایسا آئے گا کہ تالاب میں بُوند بھر پانی نہیں رہے گا۔"

کچھوا جتنا بُوڑھا تھا، اتنا ہی ضِدّی تھا۔ وہ اُونگھتے ہوئے بڑبڑایا:

"اگر آپ لوگ یہی کہنے کے لیے آئے ہیں تو مہربانی کر کے واپس چلے جائیں۔۔ اونہ! تالاب سُوکھ رہا ہے۔ کیا حماقت ہے۔ میں سیکڑوں سال سے یہاں رہ رہا ہوں۔ پہلے تو کبھی سُوکھا نہیں۔ یہ کبھی سُوکھا ہے نہ سُوکھے گا۔ سمجھے؟ اب جاؤ۔ میں سونے لگا ہُوں۔"

بُوڑھے کچھوے نے اپنی موتی جتنی آنکھوں پر پھُولے پھُولے پپوٹے گرا لیے اور ہنسوں کو بالکل بھُول گیا۔ ہنس واپس چلے گئے۔ وہ تالاب کو دیکھ دیکھ کر اُداس ہو رہے تھے۔

ہنسوں کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ تالاب کا پانی بڑی تیزی کے ساتھ خُشک ہو رہا تھا۔ کیچڑ تک سُوکھنے لی تھی اور جگہ جگہ سے پپڑیاں بن کر ٹوٹ رہی تھی۔

راج ہنس نے کہا۔ ”کچھوے میاں کُچھ ہی کہیں، ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

اس کی مادہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن جانے سے پہلے اپنے پُرانے دوست کچھوے سے مِل آئیں۔“

وہ کچھوے کے پاس پُہنچے تو وہ جاگ رہا تھا اور خاصا بے چین نظر آتا تھا۔ اُسے شاید پیاس لگی تھی، مگر پانی کہاں۔ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ اُس نے راج ہنسوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ اُنہوں نے اُسے وقت پر کیوں نہیں بتایا۔ وہ شکایت کرتے ہُوئے بولا:

”تم لوگ بہُت پتھّر دل ہو۔ مُجھے بتایا ہی نہیں کہ تالاب کا پانی خشک ہو رہا ہے۔ کیا مُجھے ان باتوں کا کیوں کر اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں پہلے جیسا جوان تو ہُوں نہیں۔ میری نظر تُمہاری نظر کی طرح تیز نہیں رہی۔ ایسے وقت میں دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔“ ”لیکن ہم تو آپ کو بتانے آئے تھے۔“ راج ہنس نے کہا۔

"میری بات مت کاٹو۔" کچھوے نے غُصّے سے کہا۔ "تُمہیں تو بزُرگوں کا کوئی احترام ہی نہیں۔ اب جو تالاب سُوکھ گیا ہے تو کیا کرو گے تُم؟"

"ہم اُڑ کر کہیں اور جا بسیں گے۔" راج ہنس نے جواب دیا۔

"واہ! اُڑ جائیں گے۔ تُم سا خُود غرض میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ بھلے لوگو، میرے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے؟"

"کاش! آپ کے پَر ہُوتے۔" راج ہنس نے کہا۔

"پَر؟ پَر؟ آہا!" کچھوے نے کہا۔ "تُمہارے بھیجے میں عقل ہوتی تو یہ بات نہ کہتے۔ ارے نادانو، اگر میرے پَر ہوتے تو میں اِس وقت یہاں بیٹھا پانی کے لیے ہانپ رہا ہوتا؟ یہ سب تُمہاری نالائقی کا نتیجہ ہے جو میں بھگت رہا ہوں۔ تُمہیں بُہت پہلے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ تالاب سوکھ رہا ہے۔ خیر، اب تُمہیں کسی نہ کسی طریقے سے مُجھے بھی ساتھ لے جانا ہو گا۔ میں یہاں پیاسا مرنے کے لیے نہیں رہوں گا۔"

"ہمارے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" راج ہنس نے کہا۔ "اگر آپ اس کو پسند کریں تو کہیں۔ "

"میں پسند یا ناپسند کیسے کر سکتا ہُوں، جب کہ مُجھے معلُوم ہی نہیں کہ وہ تجویز ہے کیا؟" کچھوے نے جواب دیا۔

"ہمارا خیال ہے کہ ہم ایک چھڑی لے کر اس کے دونوں سِروں کو اپنے مُنہ میں پکڑ لیں گے۔" راج ہنس بتانے لگا۔ "اس طرح آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"اور میں کہاں رہوں گا؟" کچھوے نے پُوچھا۔ "چھڑی تم دونوں کی چونچوں میں ہو گی۔"

"آپ اس چھڑی کو درمیان سے اپنے دانتوں سے دبائے رکھنا۔"

"سفر کا یہ طریقہ کُچھ آرام دہ نظر نہیں آتا۔" بُوڑھا کچھوا بڑبڑایا۔

"ہم تو یہی خدمت کر سکتے ہیں۔" راج ہنس نے کہا۔

"بہت خُوب! جایئے، چھڑی لے آیئے۔" یہ کہہ کر کچھوا پتھّر کا سہارا لے کر ہانپنے لگا۔ اچانک اُسے ایک خُوف ناک خیال آیا اور وہ چونک کر بولا:

"فرض کرو۔ میں گِر گیا؟"

"اگر آپ اپنا مُنہ بند رکھیں گے تو گِرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" راج ہنس نے کہا۔ "چاہے کُچھ بھی ہو، آپ بولیں ہر گز نہیں۔ بس چُپ رہیے گا۔" راج ہنس نے سمجھایا۔

"افّوہ! میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں اِس انوکھے سفر کے خیال سے خُوش ہوں۔ تُم لوگ کہتے ہو تو چلتا ہوں۔ لیکن وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ ہمیں چل دینا چاہیے۔" کچھوے نے کہا۔

رحم دل راج ہنسوں نے کہیں سے مضبُوط لکڑی کی چھڑی حاصل کی۔ دونوں نے اس کا ایک ایک سِرا اپنی چونچوں میں پکڑ لیا۔ کچھوا درمیان میں لٹک رہا تھا۔ اُس نے چھڑی کو مُنہ میں دبا رکھا تھا۔

ہنس کچھوے کو لے کر اُڑ گئے اور اُڑتے اُڑتے اُونچے آسمانوں میں چلے گئے۔ کچھوا اِس پر اعتراض کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ چھڑی اُس کے دانتوں میں تھی۔ ذرا سا بھی مُنہ کھولتا تو زمین پر گِر کر مر جاتا۔

ہنس اُڑتے ہوئے میدانوں، وادیوں، جنگلوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے گُزرے۔ جلد ہی ان کا گُزر ایک پہاڑی گاؤں کے اُوپر سے ہُوا۔ یہاں وہ کُچھ نیچے ہو گئے۔ اُنہیں یقین تھا کہ پانی سے بھرا ہوا تالاب یہیں کہیں ہو گا۔ اُس وقت گاؤں کے لڑکے پتنگ اُڑا رہے تھے۔ اُنہوں نے پَروں کی پھڑ پھڑاہٹ سُنی تو دیکھا کہ کچھوا چھڑی سے لٹکا ہوا ہے اور دو ہنس اُسے اُڑائے لیے جا رہے ہیں۔

یہ منظر دیکھ کر لڑکوں کو بڑی ہنسی آئی۔ اُن میں سے ایک نے چلّا کر کہا:

"دیکھو، دیکھو! کیا تماشا ہو رہا ہے۔ چھڑی سے چمٹے ہُوئے بُوڑھے کچھوے کو راج ہنس اُڑائے لیے جا رہے ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "اگر یہ گِر جائے تو میں اس کی گیند بناؤں گا۔" پھر سب مل کر کچھوے کا مذاق اُڑانے اور شور مچانے لگے۔ وہ تالیاں بجا بجا کر ہنس رہے تھے۔

بُڈھے کچھوے کا غُصّے کے مارے بُرا حال تھا۔

ہنسوں نے اِشاروں سے سمجھایا کہ بڑے میاں اپنی زبان ذرا بند ہی رکھنا۔ لیکن جیسے ہی لڑکوں کی آوازیں بُلند ہوئیں، کچھوا اپنے غُصّے پر قابو نہ رکھ سکا اور چیخا۔

"خبر۔۔۔دار۔۔۔"!

مُنہ کا کھُلنا تھا کہ چھڑی اُس کے مُنہ میں سے نِکل گئی اور وہ ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہُوا نیچے پتھریلی زمین پر گر پڑا۔

بے چارے ہنس بُوڑھے کچھوے کا ماتم کرتے ہُوئے اُڑ گئے۔

وہ اُڑتے ہوئے ایسی جگہ پُہنچے جہاں ایک تالاب تھا، پانی سے لبالب بھرا ہوا۔ اور خُوشی کی بات یہ تھی کہ وہاں بھی ایک کچھوا رہتا تھا، لیکن وہ مزاج کا بُہت اچھّا تھا۔ اس کچھوے سے اُن کی دوستی ہو گئی۔

سِندھُو

دریائے سِندھ کی کہانی

صدیوں پہلے، ایُودھیا کے قریب جنگل میں ایک سادھو اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ بے چارے دونوں میاں بیوی اندھے تھے۔ اگر اُن کا خدمت گزار اور پیار کرنے والا بیٹا نہ ہوتا تو وہ بھُوکے پیاسے مر جاتے۔ ان کے اِس بیٹے کا نام تھا، سِندھُو۔

سِندھُو ماں باپ کی خدمت اِتنی اچھّی طرح کرتا جیسے وہ اُن کا بیٹا نہ ہو، ماں ہو۔ اُس نے اُن کے لیے گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی بنائی تاکہ وہ دھُوپ سے بچے رہیں۔ وہ ہر صُبح ندی سے تازہ پانی لے کر آتا۔ پھر کھانے کے لیے جنگل سے پھل وغیرہ لینے چلا جاتا۔ جھونپڑی سے پُرانی گھاس، پتّے اور ٹہنیاں نِکال کر نئی لگا دیتا تاکہ وہ صاف سُتھری نظر آئے اور مضبُوط بھی رہے۔ دونوں وقت اپنے ہاتھوں

سے کھانا تیّار کر کے ماں باپ کو کھلانا۔

وہ سارا دن کام کرتا اور خوش رہتا۔ ماں باپ کی چھوٹی سے چھوٹی ضُرورت کو بھاگ بھاگ کر شوق سے پورا کرتا۔ اُن کی خُوشی ہی میں اُس کی خُوشی تھی۔ ماں باپ کو اپنے اندھے پن کا خیال آتا تو تھا، مگر مایُوس یا دُکھی ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ سِندھُو اُن کی آنکھوں کا نُور اور دل کا سرُور تھا۔

جنگل میں کوئی اور گھر تو تھا نہیں، اور نہ قریب کوئی بستی ہی تھی۔ اس لیے سِندھُو کا کوئی دوست نہ تھا۔ اس کے دوست جنگل کے جانور تھے۔ وہ سِندھُو سے بہت مانوس تھے۔ سِندھُو ندی سے پانی بھرنے آتا تو وہ بھی پانی پینے آجاتے۔ پرندے اُڑتے اُڑتے اُس کے کندھوں پر آبیٹھتے۔ ہرن اور خرگوش تو جنگل میں اُس کے ساتھ ساتھ پھرتے تھے۔ وہ جنگل کے ہر باسی کی آواز پہچانتا تھا اور اُسے ہر پرندے کی چہچہاہٹ کا پتا تھا۔

سِندھُو جنگل میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ اُس نے شہر دیکھا تھا، نہ گاؤں۔ وہ صِرف اتنا جانتا تھا کہ مُلک پر ایک بہت بڑا راجا حکُومت کرتا ہے۔ راجا کو اپنے درباریوں کے ساتھ جنگل میں شکار کرتے سِندھُو نے اکثر دیکھا تھا۔ راجا اور اُس

کے شکاری تیر کمان لیے جنگل میں آتے تو سِندھُو کو ذرا بھی اچھّے نہ لگتے۔ وہ اُداس ہو جاتا کیوں کہ راجا جب بھی شکار کرنے آتا، سِندھُو کے کئی دوست پنچھی گھائل ہو جاتے اور جنگلی جانور بُری طرح زخمی ہو کر تڑپتے۔ بھُولے بھالے لڑکے کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ انسان معصُوم ہرنوں، خرگوشوں اور رنگین پروں والے پرندوں کو کیوں مارتے ہیں۔

راجا شکار کر کے چلا جاتا تو سِندھُو کئی دِن تک غم گین رہتا۔ وہ جس راستے یا پگڈنڈی سے گُزرتا وہاں کوئی نہ کوئی زخمی اور درد سے تڑپ رہا ہوتا۔ کسی پرندے کا بازُو ٹوٹا ہے، تو کسی کی ٹانگ۔ کوئی ننّھی چِڑیا لمبی گھاس میں چھُپی اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہی ہے۔

سِندھُو سے بے چاری چڑیوں کا دُکھ دیکھا نہ جاتا۔ وہ زخمی چڑیوں کو اُٹھا کر گھر لے آتا اور اُن نے زخم دھو کر مرہم پٹّی کرتا۔ جب چِڑیا کے زخم بھر جاتے اور وہ پھر سے اُڑنے کے قابل ہو جاتی تو وہ اُسے ہوا میں اُچھال دیتا۔ چِڑیا شُکریہ شُکریہ کہتی پھُر سے اُڑ جاتی۔ سِندھُو کے دل کو اِس وقت کُچھ تسلّی ہوتی۔ وہ سوچتا کہ اُس نے

اپنے جنگلی دوستوں کی کُچھ تو خدمت کی۔

زندگی کے دِن اسی طرح گُزر رہے تھے۔ سِندھُو کو یہ زندگی بڑی پیاری لگتی تھی۔ کافی دِنوں سے راجا جنگل میں شکار کے لیے نہ آیا تھا۔ جنگلی جانور اور پرندے کافی نڈر ہو گئے تھے۔ وہ بلاخوف سِندھُو کے ساتھ اُس کی جھونپڑی تک آ جاتے۔ پرندے سِندھُو کے ہاتھ سے دانہ دُنکا چُنتے اور چوپائے گھاس پتّے کھاتے۔

ایک سُہانی صُبح، جب دھُوپ خُوب نکھری ہُوئی تھی، ٹھنڈی ہوا کے مست جھونکوں سے ہر شے جھُوم رہی تھی، سِندھُو کو کہیں دُور سے سنکھ کی آواز سُنائی دی۔ اُس کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے بے زبان دوستوں کو کیسے ہوشیار کرے۔ کس طرح اُنہیں راجا کے تیروں اور شکاری کُتّوں سے بچائے۔ راجا اور اُس کے ساتھی تِیر تانے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ اب کیا ہو گا؟ سِندھُو کا دِل خوف سے کانپنے لگا۔

سِندھُو کے باپ کو بھی سنکھ کی آواز سُنائی دی۔ وہ بولا۔ ”بیٹا، راجا اِدھر ہی آ رہا

ہے۔"

"جی ہاں۔" سِندھُو نے جواب دیا۔ "میں ننّھے مُنّے حیوانوں اور بھولی بھالی چڑیوں کے بارے میں سوچ رہا ہُوں۔ ان کا کیا بنے گا؟"

"میرے بچّے۔" باپ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "یہ جنگل اور اس کی ہر شے راجا کی ہے۔ وہ جس کو چاہے مار دے اور جس کو چاہے چھوڑ دے۔"

"اگر راجہ شیر، چیتے یا کسی درندے کا شکار کھیلنے آئے تو مُجھے دُکھ نہیں ہو گا۔" سِندھُو نے اپنے باپ سے کہا۔ "لیکن معصُوم جانور تو کسی کو کُچھ نہیں کہتے۔ پچھلی بار جب راجا شکار کے لیے آیا تھا اور اُس نے ایک نازک سی ہرن کو زخمی کر دیا تھا۔ میں اُسے اپنے ہاتھوں سے گھاس کھلایا کرتا تھا اور اُس کے بچّوں کو گود میں اُٹھا کر پیار کرتا تھا۔ وہ خُوش ہوتی تھی۔ جب راجا کے کُتّوں نے اُس کا پیچھا کیا تو وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آ کر چھُپ گئی۔ وہ میری طرف سہمی ہُوئی سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی، جیسے کہتی ہو، مُجھے بچالو، مُجھے چھُپالو، سِندھُو۔"

"لیکن میں اُس کے لیے کُچھ نہ کر سکا۔ وہ ایک پل کے لیے میرے پاس رُکی اور

پھر بھاگ کھڑی ہُوئی۔ شکاری کُتّے اُس کے پیچھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد راجا کے آدمی اور کُتّے جھاڑیوں کو روندتے ہوئے آ پہنچے۔ میں چُپ سادھے درختوں کے جھُنڈ میں چھُپا رہا۔ مُجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔"

"جب دن ڈھلا اور میں چشمے سے پانی لینے کے لیے گیا تو دیکھا کہ پگڈنڈی پر خُون کی لمبی دھار دُور تک چلی گئی ہے اور ایک جگہ وہ معصُوم ہرنی خون میں نہائی پڑی ہے۔ وہ مرنے کے قریب تھی۔ میرا دِل غم سے پھٹنے لگا۔ دوڑا دوڑا چشمے سے پانی لایا اور چُلّوؤں سے اُس کے مُنہ میں ڈالا۔"

یہ کہہ کر سِندھُو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مارے دُکھ کے اُس کے مُنہ سے لفظ نہ نکلتے تھے۔ اُس کی دوست ہرنی مر چُکی تھی۔ وہ اُس کو یاد کر کے آنسو بہانے لگا۔

باپ نے کہا۔ "بیٹا، تُم خُدا کی بنائی ہر چیز سے محبّت کرتے ہو، اور یہ اچھّی بات ہے۔ تُمہاری پرورش جنگل میں ہُوئی ہے۔ جانوروں کے دوست ہو۔ لیکن راجا کی پرورش اور طرح ہُوئی ہے۔ سیر اور شکار کو وہ اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس کی رعایا بھی

اُسے ایسا ہی دیکھنا پسند کرتی ہے۔ اگر وہ اِس طرح گھُڑ سواری، سیر اور شکار نہ کرے تو لوگ اُسے اچھا نہیں سمجھیں گے۔"

سِندھُو بولا۔ اگر راجا صِرف دِل بہلانے کے لیے معصُوم جانوروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے تو میں خوش ہُوں کہ میں راجا نہیں۔"

"اس طرح فیصلے نہیں کرتے، بیٹا۔" باپ سِندھُو کو سمجھانے لگا۔ "زندگی گزارنے کے کئی طریقے ہیں۔ راجا بہُت بڑا آدمی ہے۔ اُس کی رعایا اُس سے محبّت کرتی ہے۔ وہ پرانے رسم اور رواج کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ کِسی زمانے میں مَیں بھی راج دھانی میں رہتا تھا۔ وہاں مجھے اندازہ ہوا کہ دُنیا بے شمار اور رنگارنگ لوگوں سے مِل کر بنی ہے۔"

"میں تو کِسی بھی شہر کا رُخ نہ کروں۔" سِندھُو نے نفرت سے جواب دیا۔ "میں زندگی بھر جنگل میں رہُوں گا۔ گھاس پھُونس کی اس جھونپڑی سے زیادہ پُر سکون اور پیاری جگہ دُنیا میں کہیں اور نہیں ہو سکتی۔ بس، راجا کہیں اور جا کر شکار کھیلا کرے۔ میری یہی دُعا ہے۔ یہی خواہش ہے۔"

اس روز سِندھُو تمام دِن جھونپڑی سے باہر نہ نکلا۔ وہ اپنے معصُوم دوستوں کو زخمی اور خون میں تڑپتے ہُوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جنگل دل ہلا دینے والی چیخوں سے گُونج رہا تھا۔ خون ناک شکاری کُتّے ہر طرف بھونکتے پھرتے تھے۔ سنکھ کی منحوس آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ شکار ہانکنے والے ہاؤ ہاؤ کر کے فضا کو اور زیادہ ڈراؤنا بنا رہے تھے۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں کے دوڑنے سے جنگل میں جنگ کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ آوازیں سُن سُن کر غریب سِندھُو کا درد بھرا دل کانپ رہا تھا۔

وہ اپنے لیے خُوف زدہ نہ تھا۔ شکاری شکار کھیلنے آئے تھے۔ اندھے سادھو اور اُس کی بیوی بچّے کو مارنے نہیں۔ سِندھُو یہ بھی جانتا تھا کہ راجا نیک آدمی ہے اور وہ سادھوؤں کی بُہت عزّت کرتا ہے۔ وہ سوچا کرتا کہ کاش کبھی راجا اُسے اکیلا مِل جائے تو وہ اُس سے درخواست کرے کہ جنگل کے باسیوں کو مت مارا کرو۔ وہ بڑے بھولے ہیں۔ مگر ایسا ہونا نا مُمکن تھا۔

دن ہولے ہولے ڈھل گیا۔ شکار کا شور اور ہنگامہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ سنکھ کی

آواز مدھم پڑ گئی۔ راجا اپنے ساتھیوں سمیت جنگل سے جانے والا تھا۔ شام ہونے لگی تھی۔

سِندھُو چاند نکلنے کے اِنتظار میں تھا۔ جیسے ہی چاندنی بِکھری، اُس نے سر پر گھڑا رکھا اور چشمے سے پانی لینے چل دیا۔ وہ دونوں وقت پانی لینے جایا کرتا تھا۔ صُبح کا بھرا ہُوا پانی دن بھر کام آتا اور شام کا رات کو۔ اس کے ماں باپ سو چُکے تھے۔ اُن کے لیے دن رات برابر تھے۔ اندھوں کی دُنیا میں ہر وقت اندھیرا ہوتا ہے۔

جنگل میں دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے چاندنی پھیکی پھیکی ہے۔ اگر گھُپ اندھیرا بھی ہوتا تو بھی سِندھُو کے لیے راستہ تلاش کرنا مُشکل نہ تھا۔ جنگل کا کونا کونا اُس کا دیکھا بھالا تھا، اور وہ ہر آواز کو پہچانتا تھا۔ کوئی پرندہ پَر پھڑ پھڑاتا تو اُسے پتا چل جاتا کہ یہ فاختہ ہے۔ کوئی سرگوشی سُنائی دیتی تو وہ بتا سکتا تھا کہ ایک بندر دُوسرے بندر کو بتا رہا ہے کہ میں آ رہا ہوں۔ چشمے کے چاروں طرف اُونچی گھاس اُگی ہُوئی تھی اور ایک بڑی سی چٹان اُس کے اُوپر یُوں جھُک جاتی تھی جیسے سایہ کیے ہُوئے ہو۔ اس جگہ چشمہ کافی گہرا تھا۔ اُس کے باقی حِصّے کم گہرے تھے،

اور جگہ جگہ گڑھے سے بنے ہوئے تھے جن میں سے تازہ پانی ہر وقت پھوٹتا رہتا تھا۔

سِندھُو ہمیشہ ایک ہی گھڑے سے پانی بھرا کرتا تھا کیوں کہ اِس کا پانی باقی گڑھوں سے زیادہ میٹھا تھا۔ چشمے کا یہ حِصّہ کنارے پر اُگی ہُوئی لمبی لمبی گھاس کی وجہ سے باقی چشمے سے الگ تھا۔ وہ آہستہ سے گڑھے کے پاس گیا، بالکل ایسے جیسے سایہ ہو۔ جوں ہی وہ اپنا گھڑا بھرنے کے لیے آگے بڑھا، چاند کے آگے بادل آجانے سے اندھیرا چھا گیا۔

شکاریوں کی جماعت جو دِن میں اِدھر اُدھر بکھر گئی تھی، شام ہوتے ہی جنگل کے باہر جمع ہو گئی۔ زور زور سے سنکھ بجایا گیا تا کہ بھولا بھٹکا آدمی سُن لے اور آ جائے۔ جب سب جمع ہو گئے تو پتا چلا کہ راجا نہیں ہے۔ سب حیران اور پریشان تھے۔ وہ گھبراہٹ میں ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ لیکن کِسی کو خبر نہ تھی۔ ایک شکاری ہمیشہ راجا کے آگے آگے چلتا تھا۔ وہی کچھ بتا سکتا تھا۔ مگر وہ بھی چُپ تھا۔

ایک دفعہ پھر زور سے سنکھ بجایا گیا اور شکاری چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر جنگل میں راجا کو ڈھونڈنے چلے گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ راجا تھک کر جنگل کے سرکنڈوں والے محل میں چلا گیا ہو گا کہ کچھ دیر آرام کر لے۔

اصل میں راجا ہاتھی سے اُتر کر ایک خُوب صُورت ہرن کے پیچھے بھاگتا ہوا دُور نِکل گیا اور پھر رستہ بھُول گیا۔ اُس کے چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ پگڈنڈیاں جھاڑیوں اور لمبی گھاس سے اٹی پڑی تھیں۔ راجا کے پاس تیر کمان کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ کِتنی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ پھر اُسے خیال آیا کہ آگے بڑھنا ہی بہتر ہے۔ وہ جھاڑیوں اور گھاس کو ہاتھوں سے ہٹاتا آگے بڑھا اور چشمے کے کنارے پہنچ گیا۔

اب رات ہو چکی تھی۔ تھکا ہارا راجا نرم نرم گھاس پر لیٹتے ہی سو گیا۔ اُس کی آنکھ اُس وقت کھُلی جب چاند کافی اُونچا ہو گیا اور شبنم کے قطروں سے اُس کے کپڑے گیلے ہو گئے۔

وہ انگڑائی لے کر اُٹھا اور ہولے ہولے اُس چٹّان پر چڑھ گیا جو چشمے کے اُوپر

جھکی ہُوئی تھی۔ جنگل کی خاموش خُوب صُورتی نے اُس کے دِل کو لبھا دیا۔ نتھرے ہوئے صاف پانی پر پھیلی ہوئی چاندی اور اُس میں ڈولتا ہُوا چاند، یہ چیزیں کتنی بھلی لگ رہی تھیں۔ اچانک کِسی کے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ راجا نے سوچا کہ کوئی ہرن چشمے پر پانی پینے آ رہا ہے۔

اُس نے جھٹ تیر چڑھایا اور نشان لگانے کے لیے تیّار ہو گیا۔ اُس کے کان آواز پر تھے۔ جیسے ہی چِلّا کھینچا، چاند کے سامنے بادل آ گیا۔ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔

اب اُسے آواز کُچھ قریب سُنائی دی۔ یُوں لگتا تھا کہ چشمے کے پانی کو کوئی آہستہ آہستہ چھیڑ رہا ہے۔

راجا کے کان آواز پر لگے ہوئے تھے اور وُہ سخت پریشان تھا۔ اِس جگہ کِسی انسان کی موجودگی کا خیال اس کو آ ہی نہیں سکتا تھا۔ بھلا اتنے گھنے جنگل میں کون رات کے وقت چشمے سے پانی لینے آ سکتا ہے۔

اُس نے دِل ہی دِل میں فیصلہ کر لیا کہ اب اگر آواز آئی تو آواز کی سمت تیر چلا

دُوں گا۔ آواز پر تیر چلا کر شکار کرنا راجا کے لیے کوئی بات نہ تھی۔ اُس کا نشانہ کبھی خالی نہ جاتا تھا۔

ایک منٹ گزرا۔ پھر دوسرا۔ تیسری بار پھر وہی آواز سُنائی دی۔ راجا نے آواز کی سمت تیر چھُوڑ دیا۔ اُسی وقت ایک لڑکے کے گانے کی آواز آئی۔ لیکن فوراً ہی وہ آواز چیخ بن کر جنگل میں گُونج گئی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی بھاری سی چیز چشمے میں گِر گئی ہے۔ راجا اندھا دُھند آواز کی سَمت دوڑا۔

سِندھُو لمبی لمبی گھاس اور کیچڑ میں پڑا تھا۔ اُس کا چہرہ چاندنی میں دمک رہا تھا۔ پاس ہی اُس کا ٹُوٹا ہُوا گھڑا پڑا تھا۔ زخم اُس کی چھاتی میں لگا تھا اور بہتے ہُوئے خُون نے اُس کی سفید قمیص کو رنگ دیا تھا۔ اُس میں ابھی تھوڑی جان باقی تھی۔ جب راجا جھُک کر اُسے دیکھنے لگا تو وہ مُسکرا دیا۔

راجا نے سِندھُو کو سہارا دے کر اُٹھایا اور اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ وہ اُس کے سر دہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر گرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اور خُوف، غم اور غُصّے میں نہ معلُوم کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ اُس نے ایک سادھو کو

گھائل کیا ہے۔ سادھو کو مارنا بُہت بڑا گناہ ہے۔ یہ جُرم تو موت سے بھی زیارہ بھیانک ہے۔

سِندھُو راجا کے دِل کی ہر بات جان چُکا تھا۔ اُس نے ڈوبتی ہُوئی آواز میں راجا سے پُوچھا:

"مہاراج، آپ کو کِس بات کا ڈر ہے؟ آپ کو مُجھ سے دُشمنی تو نہ تھی۔ آپ مُجھ کو مارنا نہ چاہتے تھے۔ آپ تو مُجھ کو جانتے ہی نہیں۔ اِس لیے فکر نہ کیجیے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا، کیوں کہ موت تو اِک دِن آنی ہے۔ مُجھے فکر ہے تو ایک بات کی۔ میں مرنے سے پہلے آپ سے دو چیزیں مانگوں گا۔"

"تم چاہو تو میری جان لے لو۔ مُلک لے لو۔" راجا کی آواز غم سے کانپ رہی تھی۔

"آپ کی جان یا مُلک لے کر میں کیا کروں گا؟" سِندھُو نے جواب دیا۔ "نہیں مہاراج، میں آپ سے صرف اِتنی درخواست کروں گا کہ میرے بعد میرے ماں باپ کا خیال رکھنا۔ وہ اندھے ہیں اور اِس پگڈنڈی کے سِرے پر گھنے جنگل میں

رہتے ہیں۔ میں اُنہیں سوتا ہُوا چھوڑ کر پانی لینے آیا تھا تا کہ جب وہ جاگیں تو اُن کو پانی پلا سکُوں۔ وہ مُجھے جھونپڑی میں نہ پا کر پریشان ہوں گے۔ مہاراج میرے ماں باپ کا خیال رکھیے۔ میں آپ کو دُعا دُوں گا۔"

"میں اُن کو اپنے ماں باپ کی طرح سمجھوں گا۔" راجا نے کہا۔ "اب دُوسری بات بتاؤ۔ میرے دِل کو چین نہیں آ رہا۔ مُجھ سے بے خبری میں بُہت بڑا گناہ ہو گیا ہے۔ میں اِس گناہ کے بُوجھ کو کم کرنا چاہتا ہُوں۔" سِندھُو چند لمحے خاموش رہا۔ وہ آخری بات کرنے کے لیے اپنی پُوری طاقت لگا رہا تھا مگر الفاظ اُس کے مُنہ سے نکلتے نہ تھے۔ آخر اُس نے پورا زور لگا کر کہنا شروع کیا:

"میرے چھوٹے چھوٹے معصُوم اور بے ضرر دوست، ننّھی چِڑیاں، بھولے بھالے ہرن اور خرگوش، کسی کا کُچھ نہیں بگاڑتے۔ آیندہ آپ جنگل میں شکار کھیلنے آئیں تو میری خاطر اِن کو کُچھ نہ کہیے۔ میری خاطر۔۔۔ میری خاطر۔"

آخری الفاظ سِندھُو کے مُنہ سے ایسے نکلے جیسے وہ سرگوشی کر رہا ہو۔ وہ ہر لفظ کہہ کر لمبی سی سانس لیتا تھا۔ یہ سِندھُو کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے بعد وہ اِس دنیا

میں نہ رہا۔

راجا نے اُس کے مُردہ جسم کو بانہوں میں اُٹھایا اور اُس کی ٹھنڈی پیشانی چوم لی۔ پھر غم سے بوجھل دِل کے ساتھ لاش کو سینے سے لگائے، جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔ راجا کو یوں لگتا تھا کہ یہ بوجھ اُس کی بانہوں میں نہیں، اُس کے دل میں ہے جو ہمیشہ ہمیشہ اُس کے ساتھ رہے گا۔

مکّار سادھو

بُہت دِنوں کی بات ہے، کوئی سادھو پھرتا پھراتا ایک بڑے شہر میں آ نِکلا اور ایک برگد کے درخت کے نیچے ڈیرا ڈال دیا۔ اِتّفاق سے یہ درخت راجا کے محل کے دروازے کے سامنے تھا۔

آلتی پالتی مار، آسن لگا، آنکھیں بند کر، سادھو خُدا کی یاد میں مصرُوف ہو گیا۔ ہلنا نہ جُلنا، کھانا نہ پینا، دیکھنا نہ بات کرنا۔ اسی حالت میں کئی دِن گُزر گئے۔

راجا کی راج دھانی (دارُ الحکُومت) میں اکثر سادھو بھیک مانگنے آتے تھے۔ بھبھُوت ملے، بال بڑھائے، ننگ دھڑنگ۔ صرف کمر میں چھوٹی سی لنگوٹی۔ اور اگر کپڑے پہنے ہوتے تو اِتنے پھٹے پُرانے کہ یُوں معلُوم ہوتا کہ تیز ہوا سے ان کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔ اُن کے کپڑوں کا رنگ گیروا ہوتا تھا۔

لیکن ہماری کہانی کا سادھو صاف سُتھرا سادہ تھا۔ وہ گہرے نیلے رنگ کے کھدّر کا

لباس پہنتا۔ اُس کی داڑھی اور سر کے بال گھنگریالے اور سیاہ تھے۔ لگتا تھا روز کنگھی کرتا ہے۔

اِس سادھو کے آنے کی خبر دُور دُور تک پھیل گئی۔ جو بھی سُنتا اس کی زیارت کرنے ضرُور آتا۔ برگد کے درخت کے نیچے لوگوں کا اچھّا خاصا میلا رہنے لگا۔ لوگ اِس انتظار میں رہتے کہ کب وہ آنکھ کھولے اور کب وہ اس سے دُعا کے لیے درخواست کریں۔

ہوتے ہوتے سادھو کی شُہرت راجا کے کانوں تک بھی پُہنچی۔ وہ بڑی عقیدت کے ساتھ سادھو سے ملنے کے لیے آیا اور کہا کہ میں آپ کے یہاں آنے پر نہ صرف خُوش ہُوں بلکہ مُجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ کے دم قدم سے میری مُراد پوری ہو جائے گی۔ مُجھے ہر نعمت میسّر ہے، مگر بیٹا نہیں۔ صِرف ایک بیٹی ہے جس کی عُمر چودہ سال ہے۔ راج کُماری بے حد حَسین تھی۔ رواج کے مُطابق اُس کی منگنی بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ اس کا منگیتر پڑوس کی ایک ریاست کا راج کُمار تھا۔ ایک دو برس کے اندر اُن دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ شادی ہونے تک راج

کُماری کے باہر آنے جانے پر پابندی تھی۔ بس وہ راج محل کے زنان خانے میں رہتی۔ اگر سیر کرنے کو جی چاہتا تو پہرے داروں کے ساتھ جاتی تھی۔

اِتنی حسین بیٹی کا باپ ہوتے ہُوئے بھی راجا خُوش نہ تھا۔ اُس کو ایک ہی لگن تھی کہ اگر ایک بیٹا ہوتا تو اُس کی موت کے بعد راج کرتا۔

سادھو کی شُہرت سُن کر اُس کے دِل میں خیال آیا کہ اگر یہ اللہ والا فقیر اُس کے لیے دُعا کرے تو شاید خُدا اس کے من کی مُراد پوری کر دے۔ اس خیال سے راجا نے سادھو کے لیے محل کے اندر ایک مندر بنا دیا۔ مندر جانے کا رستہ درختوں کے جھنڈ میں سے ہو کر گُزرتا تھا۔ اُس کے چاروں طرف اُونچی چار دیواری بنادی گئی تھی۔

جب یہ شان دار مندر تیّار ہو گیا تو راجا نے سادھو سے درخواست کی کہ مہاراج، مندر میں تشریف لے چلیں کیوں کہ یہ جگہ آپ کے لیے مناسب نہیں۔ سادھو نے راجا کی درخواست قبول کر لی اور چیلوں کو لے کر مندر میں چلا گیا۔

سادھو کی خبر زنان خانے میں پُہنچی تو نوجوان راج کُماری کے دِل میں اُس کو

دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اصل میں وہ اپنے منگیتر راج کُمار کے بارے میں سادھو سے کُچھ باتیں معلُوم کرنا چاہتی تھی۔

ایک رات راج کُماری نے اپنی آیا کو ساتھ لیا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپتی چھُپاتی مندر تک پہنچ گئی۔

مندر میں سادھو موجود تھا۔ وہ راج کُماری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتنی خُوب صُورت لڑکی اُس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ اُس نے راج کُماری سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔ یہ سُن کر راج کُماری کو بہت صدمہ ہُوا۔ اُس نے ساڑھی کے پلّو سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور وہاں سے بھاگ نِکلی۔

سادھو کو راج کُماری سے یہ اُمّید نہ تھی۔ اُسے بہُت غُصّہ آیا۔ اس نے خنجر نکالا اور زور سے گھُما کر بھاگتی ہُوئی لڑکی کے پیچھے پھینکا۔

خنجر راج کُماری کے پیر میں لگا۔ اُس نے خنجر کھینچ کر پرے پھینک دیا اور دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں پُہنچ کر اُس نے زخم دھویا اور مرہم پٹی کی۔ آیا دبے پاؤں کمرے میں آئی تو دیکھا کہ راج کُماری سوئی ہُوئی ہے۔

دِن چڑھے راجا سادھو کے پاس آیا تو دیکھا کہ اُس کا پیر نہ اُس سے بات چیت کرتا ہے نہ اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے۔ راجا نے اپنے جُوتے مندر کے باہر اُتارے اور چند قدم اندر گیا۔ مگر سادھو پتھّر کا بُت بنا بیٹھا رہا۔ راجا نے عاجزی سے پُوچھا:

"کیا بات ہے، مہاراج؟ مُجھ سے کیا گناہ ہوا ہے جو آپ یوں خفا ہیں؟"

سادھو نے راجا کی کِسی بات کا جواب نہ دیا اور اُسی طرح بیٹھا رہا۔ راجا نے پھر کہا:

"کل ہی کا واقعہ ہے، ہم کتنی دیر باتیں کرتے رہے۔ میں آپ کے عِلم کے دریا سے اپنی پیاس بُجھاتا رہا۔ کیا آج آپ ایک لفظ بھی نہیں کہیں گے؟"

سادھو نے غُصّے سے جواب دیا:

"مجھے کُچھ نہیں کہنا، اس لیے کہ تُم سُن نہیں سکو گے۔"

راجا نے بڑی عاجزی سے کہا:

"مہاراج، آپ جانتے ہیں کہ آپ کے مبارک ہونٹوں سے نکلی ہُوئی ہر بات

میرے کانوں میں رس گھولتی ہے۔"

سادھو چُپ رہا۔ کچھ دیر راجا کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

"بہتر یہی ہے کہ کل رات میں جس راز سے واقف ہُوا ہُوں، اُس سے تُم ناواقف رہو۔"

یہ سُن کر راجا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وُہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا:

"مہاراج، آپ کی باتوں سے معلُوم ہوتا ہے کہ مُجھ پر کوئی مُصیبت آنے والی ہے۔"

"بالکل۔ تُم ٹھیک کہتے ہو۔" سادھو نے جواب دیا۔ "کوئی ایسی صورت نہیں ہُو سکتی کہ یہ مُصیبت ٹل جائے؟" راجا نے پُوچھا۔

تب سادھو نے رُک رُک کر کہا:

"بیٹا، اس شہر میں ایک بد روح رہتی ہے۔ اگر تُم نے اُسے یہاں سے نہ نِکالا تو صِرف تُم بلکہ تُمہاری پوری ریاست تباہ و برباد ہو جائے گی۔"

راجا نے پُوچھا۔

"مہاراج، آپ کو کِس طرح پتا چلا کہ وہ بد روح یہاں رہتی ہے؟ آپ تو دُنیا سے بے خبر عِبادت میں مشغُول رہتے ہیں۔ یہ بد روح آپ پر کِس طرح ظاہر ہوئی؟"

سادھو نے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور کہنا شروع کیا:

"کل رات جب میں عِبادت میں مشغُول تھا اور مُجھے اِرد گرد کی کُچھ خبر نہ تھی، یہ بدرُوح میرے پاس آئی۔"

خوف کے مارے راجا کی آواز کانپ رہی تھی۔ اُس نے پوچھا": مہاراج، یہ بد روح کِس شکل میں آپ کے سامنے آئی؟"

"عام طور پر ایسی بد روحیں نہایت ہی ڈراؤنی شکل میں آدمی کے سامنے آتی ہیں۔ لیکن یہ جان کر تُم حیران ہو گے کہ یہ بدرُوح عجیب و غریب طریقے سے میرے سامنے آئی۔ جب میں خُدا کی یاد میں مگن تھا، مُجھے دُور سے ایک مدّھم سی آواز سُنائی دی۔ جب میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو مندر کے دروازے میں ایک

نہایت حسین، معصُوم خُوب صُورت لڑکی کھڑی تھی۔ میں اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اچانک اُس کا فرشتوں جیسا نُورانی چہرہ بدلنے لگا۔ اب میرے سامنے ایک نہایت بدصورت درندہ کھڑا تھا۔ میں سادھو نہ ہوتا تو وُہ بدرُوح مُجھے نِگل جاتی۔"

خُوف سے راجا پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اُس نے ڈری سی آواز میں سادھو سے پُوچھا:

"مہاراج، اِتنا بتا دیجیے کہ اس بدرُوح کو کِس طرح پہچانا جا سکتا ہے، جو حسین لڑکی کے رُوپ میں ظاہر ہوتی ہے۔" سادھو نے غور سے راجا کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت ایک عام کمزور اور ڈرپوک انسان نظر آ رہا تھا۔

"اور اس کی ایک ٹانگ زخمی ہے۔ یہی اُس کی نشانی ہے۔ جب اُس کو تلاش کر لو تو میرے پاس آنا۔ پھر میں تُمہیں بتاؤں گا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔"

راجا یہ سُنتے ہی محل میں گیا اور فرمان جاری کیا کہ ریاست کی ہر لڑکی اُس کو اپنے پیر دکھائے۔ تمام لڑکیوں نے حکم کی تعمیل کی مگر کسی لڑکی کے پیر پر زخم نہ تھا۔ آخر راج کُماری کی باری بھی آ گئی۔ وہ اپنے پیر کے زخم کو کیوں کر چھُپا سکتی تھی۔ راز کھُل گیا۔

راجا غم اور غُصّے سے پاگل ہو گیا۔ بھاگا بھاگا سادھو کے پاس پُہنچا اور یہ بُری خبر اُس کو سُنائی۔ سادھو تیّار ہی بیٹھا تھا۔ فوراً بولا:

"تم نے اس لڑکی کی چودہ برس تک پرورش کی۔ افسوس! تُمہارے ساتھ دھوکا ہوا۔ تُمہاری اصلی بیٹی پیدا ہوتے ہی چُرا لی گئی اور اس کی جگہ ایک بد روح کو انسانی شکل میں رانی کی گود میں ڈال دیا گیا تھا۔ اب تم جو چاہو کرو۔ میں نے اصلیّت سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔ لیکن اِتنا یاد رہے کہ اگر تُم نے اس بھُتنی کو یُوں ہی چھوڑے رکھا تو ایک نہ ایک دن یہ تُمہیں اور تُمہاری سلطت کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔"

راجا سادھو کی ہر بات اس طرح مانتا تھا جیسے اُس کا کہا خُدا کا حکم ہو۔ اُس نے پوچھا کہ اب میں کیا کروں، مہاراج؟ تو سادھو بولا:

"تُمہیں اس بھُتنی کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ تم میرے پاس دو بڑھئی بھیج دو۔"

راجا نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور دو بڑھئی سادھو کے پاس بھیج دیے۔

سادھوئے بڑھیوں کو اتنا بڑا صندُوق بنانے کا حکم دیا جس میں ایک آدمی لیٹ سکے اور اس میں کہیں سے پانی یا ہوا کا گُزر نہ ہو۔ بڑھئی کوئی ایسے ویسے بڑھئی تو تھے نہیں۔ شاہی بڑھئی تھے۔ اُنہوں نے ایسا اچھّا صندُوق تیّار کیا جِسے دیکھ کر سادھو خُوش ہو گیا۔

اب سادھو کے حکم کے مطابق راجا راج کُماریکو مندر میں لایا۔ ڈری سہمی راج کُماری اُس وقت اور زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ راجا اور سادھو نے مل کر اُس کو صندُوق میں بند کر دیا۔ پھر صندُوق کا ڈھکنا بند کر کے اُس میں لوہے کی بڑی بڑی کِیلیں ٹھونک دیں۔ اس کے بعد صندُوق کو ندی میں بہا دیا۔

غم زدہ، تھکا ہارا راجا تو محل میں واپس چلا گیا اور سادھو نے اپنے دو چیلوں کو بُلایا اور اُن سے کہا:

"آج ندی میں ایک صندُوق تیرتا ہُوا آئے گا۔ اس میں خزانہ بھرا ہے۔ ندی کے کنارے کنارے چل کر اُس صندُوق کو تلاش کرو، چاہے چلتے چلتے ساتھ کی ریاست میں پُہنچ جاؤ۔ تُمہیں ہر قیمت پر یہ صندُوق میرے پاس لانا ہے۔ میں

مندر میں اِنتظار کروں گا۔"

چیلے سارا دن ندی کے کنارے گھومتے رہے پھر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ زور کی بھُوک بھی لگنے لگی۔ اُنہوں نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ پھر آرام کرنے جو لیٹے تو خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگے۔ لکڑی کا صندُوق ندی میں تیرتا پھرتا تھا مگر سادھو کے چیلے خرّاٹے لے رہے تھے۔ رات بیت گئی۔ دِن نکل آیا۔

اِتّفاق سے ندی کے کنارے، جنگل میں پڑوسی ریاست کا راج کُمار شکار کھیلنے آیا ہوا تھا۔ یہ ندی اصل میں اُس کے باپ کی ریاست اور راج کُماری کے باپ کی ریاست کے درمیان سرحد تھی۔ راج کُمار ایک سفید ہرن کا پیچھا کرتا ندی کے کنارے آ پُہنچا۔ اُس کے ایک ساتھی نے چِلّا کر کہا:

"دیکھیے! ہرن تو ندی کے بیچ میں نظر آ رہا ہے۔"

راج کُمار نے دیکھا کہ کوئی چیز ندی کی لہروں پر ڈول رہی ہے۔ لیکن یہ سفید ہرن ہرگز نہیں تھا بلکہ ایک بڑا سا صندُوق تھا۔

بُہت سے شکاری ندی میں کُود پڑے اور آن کی آن میں صندُوق کھینچ کے کنارے پر لے آئے۔ پھر اپنے خنجروں سے صندُوق کا ڈھکنا کھولا۔ صندُوق کے اندر ایک خُوب صُورت لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ تازہ ہوا کے لگتے ہی راج کُماری کو ہوش آ گیا۔ جب وہ بات چیت کرنے کے قابل ہوئی تو راج کُمار نے پُوچھا۔ ”تُم کون ہو، اور کِس نے تُمہیں صندُوق میں بند کر کے دریا میں ڈالا؟“

راج کُماری نے اپنی آپ بیتی کہہ سنائی۔ اس نے بتایا کہ اُس کا باپ اِن دِنوں ایک بدمعاش سادھو کے جھانسے میں آیا ہُوا ہے، اور اُس کو بُہت پُہنچا ہُوا سمجھتا ہے۔ اُس نے اُسی سادھو کے کہنے پر مُجھے صندُوق میں ڈالا اور ندی میں بہا دیا۔ راج کُماری نے راج کُمار کو یہ بالکل نہیں بتایا کہ ایک رات وہ چوری چوری سادھو کو دیکھنے کے لیے مندر میں گئی تھی۔

راج کُمار نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے، آپ ہی میری منگیتر ہیں۔“

یہ سُن کر راج کُماری نے اپنا چہرہ گھونگھٹ میں چھُپا لیا اور بولی۔ ”اگر اُس خبیث سادھو کو پتا چل گیا کہ میں صندُوق میں سے زندہ بچ نِکلی ہوں تو وہ مُجھے جان سے مار کر ہی دم لے گا۔“

یہ کہہ اب اُس نے راج کُمار کو اصل قصّہ بھی سُنا دیا کہ کِس طرح وہ رات کو چھُپ چھُپا کر سادھو کو دیکھنے گئی تھی اور کِس طرح سادھو نے خنجر مار کر اُسے زخمی کر دیا تھا۔

راج کُمار اپنی منگیتر کو لے کر راج دہانی آیا اور وزیرِ اعظم کو بُلا کر کہا:

”دریا کے کنارے لکڑی کا ایک بہت بڑا صندُوق پڑا ہے۔ اُس صندُوق میں اس پاگل بندر کو بند کر دیا جائے جس کو ہم نے زنجیروں سے باندھ رکھا ہے۔ اِس کے بعد اُسے سادھو کے مندر کے قریب ندی میں ڈلوا دیا جائے۔“

وزیر بندر کو لے کر فوراً ندی پر پُہنچا۔ اُس نے بندر کو صندُوق میں ڈالا، ڈھکنا بند کیا، خُوب کِیلیں ٹھونکیں اور پھر ندی میں اُس جگہ پہا دیا جہاں سادھو کے چیلے صندُوق کے آنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔

اچانک دوسرے کِنارے سے صندُوق کو آتے ہُوئے دیکھا تو چیلے خُوشی سے اُچھل پڑے۔ فوراً بڑے بڑے بانس پانی میں ڈالے اور صندُوق کو کھینچ کر کنارے پر لے آئے۔ پھر وہ اُسے اُٹھا کر سادھو کے مندر میں لے گئے، جہاں

سادھو اُن کا اِنتظار کر رہا تھا۔ چیلوں نے صندُوق گُرو کے حوالے کیا اور بڑے شوق سے اُس کے کھُلنے کا اِنتظار کرنے لگے۔ لیکن سادھو نے اُن سے کہا:

"تم لوگ جاؤ۔ میں اِسے تنہائی میں کھولوں گا۔ اور ہاں، اگر میں چیخوں یا رونے دھونے کی آوازیں سُنائی دیں تو بالکل پروانہ کرنا۔ اب جاؤ۔ مندر سے نِکل جاؤ۔"

چیلے مندر سے باہر چلے گئے اور دروازہ اچھّی طرح بند کر دیا۔ لیکن حیرانی کے عالَم میں وہ مندر کے دروازے پر کان لگا کر بیٹھ گئے۔

اچانک مندر کے اندر سے دل دہلا دینے والی چیخیں سُنائی دینے لگیں۔ لیکن چیلوں نے اندر جانے کی جرأت نہ کی کیوں کہ اُن کے گُرو نے اُن کو تاکید کی تھی کہ چاہے جو کُچھ بھی ہو، وہ اندر نہ آئیں۔ یکایک ایک ہولناک چیخ سُنائی دی، اور پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔

یہ خاموشی چیخ سے کہیں زیادہ خوف ناک تھی۔ چیلے کُچھ دیر اِنتظار کرتے رہے۔ پھر حوصلہ کر کے مندر کا دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھے۔ جُوں ہی دروازہ کھلا، ایک موٹا تازہ بندر چیختا غرّاتا باہر کی طرف لپکا اور محل کی دیوار پھاند تا جنگل

کی طرف بھاگ گیا۔

اب جو چیلوں نے مندر کے اندر جھانک کر دیکھا تو توبہ توبہ! خُدا کی پناہ! وہ دونوں اُلٹے قدیوں چیختے چلّاتے محل کے دروازے کی طرف دوڑے۔

راجا کے سپاہی مندر میں گئے تو کیا دیکھا کہ سادھو خُون میں لت پت مرا پڑا ہے۔

سادھو کی موت کی خبر راج کُماری اور راج کُمار کو معلُوم ہوئی تو وہ بُہت خُوش ہوئے اور اُسی وقت تھوڑی سی فوج لے کر راج کُماری کے مُلک روانہ ہو گئے۔ راج کُماری کے باپ کو اصل قصّہ معلُوم ہوا تو وُہ اپنی نادانی پر بُہت شرمندہ ہُوا، راج کُماری کو سینے سے لگایا، پیار کیا اور راج پاٹ راج کُماری کے شوہر کے حوالے کر کے خُود خُدا کی عبادت کرنے لگا۔